مجلہ طلوعِ اسلام کا اجرا ۱۹۳۸ء میں علامہ محمد اقبال کے ایما اور قائدِ اعظمؒ کی خواہش پر عمل میں آیا۔

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۶۲۱۹

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۲
صبحِ بہار	علامہ پرویز	۷
توحیدِ خالص	اسلم رانا	۱۳
کیا ہم آزاد ہیں؟	علامہ پرویز	۲۴
اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول	ڈاکٹر محمد صدیق	۵۰
پاکستان میں غلامی کا شجرۃ الزقوم	حسین امیر فرہاد	۵۷
حقائق و عبر	ادارہ	۵۹
حضرت موسیٰؑ کی دعا	اعزاز الدین احمد خاں	۶۲
امتِ مسلمہ کی ذمہ داریاں	کرنل غلام سرور	۶۳
زاویۂ کتب	ادارہ	۶۷
ناموسِ صحابہ یا توہینِ صحابہ	ثناء اللہ	۶۸
بچوں کا صفحہ	علامہ پرویز	۷۲
انگریزی مضمون	اعزاز الدین احمد خان	۷۵

انتظامیہ

چیئرمین بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اعزاز الدین احمد خاں

ناظم۔ محمد لطیف چوہدری

مجلسِ ادارت

حسین امیر فرہاد۔ میجر محمد یوسف ڈار۔ محمد عمر دراز

ناشر: عطاء الرحمٰن ارائیں

طابع: سید عبد السلیم

مطبع آفتاب عالم پریس ۱۲ ہسپتال روڈ لاہور

مقامِ اشاعت

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور۔

جلد ۴۷ ——— اگست ۱۹۹۴ء ——— شمارہ ۸

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ: ۱۰/- روپے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۵/۶۷)

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا.....

بھارت سپر پاور بن رہا ہے. ایٹمی تجربہ بھی کر چکا ہے. روس کے تعاون سے ایٹمی آبدوز تیار کر رہا ہے. حال ہی میں پرتھوی اور اگنی میزائل کا کامیاب تجربہ کر چکا ہے. اب "سوریا" نام کا بین البراعظمی میزائل بنا رہا ہے. تفصیل کے لئے اسی پرچہ میں کرنل غلام سرور کا مضمون (بھارت کے جارحانہ عزائم اور امتِ مسلمہ کی ذمہ داریاں) پڑھیے. امریکہ کو ہمارے ایٹمی پروگرام سے سخت تشویش ہے. جب کہ بھارت کی طرف سے اس نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں. بلکہ اشیرواد بھی دے رکھی ہے. اس لئے کہ بھارت اسرائیل کا دوست ہے. زمانے سے اسے تسلیم کر رکھا ہے. سفارتی اور تجارتی تعلقات ہیں. ہنود اور یہود کا گٹھ جوڑ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں. جو یہود پر مہربان اس پر امریکہ مہربان — یہ ہے بنیادی سبب بھارت کی طرف امریکہ کے جھکاؤ کا.

پاکستان کے بڑے بڑے شہروں پر بھارتی اور اسرائیلی جارحیت کا خطرہ دن بدن بڑھ رہا ہے. یہود اور ہنود پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر تلے ہوئے ہیں. وہ پختونستان، پنجاب، بلوچستان، سندھو دیش اور لیاقت آباد بنانے کی فکر میں ہیں اور ہم کیا کر رہے ہیں. ہم ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے اقتدار کے لئے دست و گریباں ہیں.

دانشمندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہمارے سیاسی قائدین اس عفریت سے بچنے کی تدابیر کریں ورنہ — ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں — ہمارے اکابرین مال و دولت جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں. قصور و محلات اور پلازے تعمیر کر رہے ہیں. جاہ و منصب کے حصول میں لگے ہیں. ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں اسپ تازی بنے ہانپ رہے ہیں. اس کا نتیجہ کیا نکلے گا. وہی جو خالقِ کائنات نے فرمایا ہے.

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۙ (التکاثر ۱:۲)

تمہیں معلوم ہے کہ وہ کونسی چیز ہے کہ تمہیں صحیح منزل مقصود کی طرف سے یکسر غافل کر دیتی ہے؛ وہ چیز ہے مال و دولت، جاہ و منصب میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ہوس. اگر تم اپنی طلب کو اپنی ضروریات تک محدود رکھو تو اس کی ایک

حد ہو گی. لیکن جب جذبۂ محرکہ ایک دوسرے سے آگے نکل جانا ہو تو اس کی کوئی حد
ہی نہیں ہو سکتی. اس جذبہ کے ماتحت کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جتنا حاصل کرتے جاؤ اتنی
ہی ہوس بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ انسان قبر کے گڑھے تک جا پہنچتا ہے۔

غلط کام کے نتائج تو ہر جگہ ہر دور میں یکساں ہوں گے. اگر دیگر قومیں اپنی غلط روش کی وجہ سے تباہ ہو گئیں تو یقیناً ہمارا انجام بھی ان سے مختلف نہ ہو گا. پانی آگ پر رکھنے سے کھولتا ہے. مگر ایک دم نہیں، پہلے چھوٹے چھوٹے بلبلے بنتے ہیں پھر شوں شوں کی آواز آتی ہے. بالآخر ایک خاص ٹمپریچر پر پہنچ کر پانی ابلنے لگتا ہے۔

ہندو ہماری تباہی کے درپے ہے. اس سے پہلے کہ ہمارا نام و نشان مٹ جائے ہمیں مہلت سے فائدہ اٹھانا چاہیے — ورنہ

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۝ (۴۴/۲۹)

سو ان کی تباہی پر نہ آسمان رویا نہ زمین اور نہ ہی انہیں مہلت دی گئی کیونکہ ظہورِ نتائج
کے وقت مہلت نہیں ملا کرتی۔

مگر ہمارے قائدین اس مہلت سے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں. حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف اپنی تمام تر توانائیاں ایک دوسرے کو زیر کرنے میں صرف کر رہے ہیں. ہنود و الیہود ہماری شہ رگ تک پہنچ چکے ہیں. یہ موقعہ کسی حد تک انہیں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کی کشمکش نے مہیا کیا ہے وکذٰلک بیرونی کمپنیاں بھی دن رات اپنی اپنی مصنوعات کی قیمتیں بڑھانے میں لگی ہیں کیونکہ انہیں علم ہے کہ حکومت تو حزبِ اختلاف کے ساتھ برسرِپیکار ہے ہماری طرف کس کا دھیان جا سکتا ہے. یہ ہوشربا مہنگائی کا نتیجہ ہے کہ ملک میں چوری چکاری، ڈاکے اور رشوت کا بازار گرم ہے۔

پاکستان کے عوام حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کی چکی کے دو پاٹوں میں پس رہے ہیں. کوئی نہیں سوچتا کہ قرآنِ کریم کی رُو سے فرقہ بندی، پارٹی بازی شرک ہے (۳۰/۳۲). قرآنِ کریم میں تو دو پارٹیوں کا ذکر ہے حزب اللہ (۵۸/۲۲) حزب الشیطان (۵۸/۱۹). دین تو مختلف پارٹیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. مسلمانوں کو ملّتِ واحدہ کہا گیا ہے. اسلامی مملکت کے ایوانِ پارلیمان میں تمام ارکان وہ ہوں گے جن کا فریضہ ان اصول و اقدار کو قانونی شکل دے کر ملک میں نافذ کرنا ہے. ہمارے ہاں ہارنے والی پارٹی کے اسمبلی میں نمائندے تہیہ کر لیتے ہیں کہ نہ کھیلیں گے اور نہ کھیلنے دیں گے. ایوان گالی گلوچ اور مار کٹائی کے اکھاڑے بنے ہوئے ہیں؛ ایک دوسرے سے تعاون تو دُور کی بات ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ اپنے دورِ خلافت میں اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھ سے بہتر دور ابا بکرؓ

عمرؓ و عثمانؓ کا تھا۔ انہیں میں مشورے دیا کرتا تھا' افسوس مجھے مشورہ دینے والا کوئی نہیں۔

دیکھا آپ نے کہ صدرِ اوّل کے مسلمان ایک دوسرے کو مشورہ دیا کرتے تھے اور ہم جو اُن کے نام لیوا ہیں ایک دوسرے کے لئے گڑھا کھود رہے ہیں، اقتدار حاصل کرنے کے لئے " زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ" تباہی کے دھانے تک پہنچ چکے ہیں۔ افسوس کہ پیش آمدہ خطرات کا احساس تک کسی کو نہیں۔ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس کا آج گذشتہ کل کی طرح گزرا فاهلك نفسهٗ اس نے اپنے آپ کو ہلاک کیا۔ ہماری تو نصف صدی ایک جیسی گذری۔ اس خیال میں نہیں رہنا چاہیئے کہ اللہ ہماری حالت بدلے گا۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) اللہ اس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتا جس قوم کو اپنی حالت بدلنے کا خیال نہ ہو۔

اے راہنمایانِ قوم! یہ آیت کہیں تمہارے بارے میں تو نہیں؟ وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ..... (۳۴/۳۳)۔

"جب یہ لیڈر ایک طرف اپنے سامنے عذاب کو تیار دیکھیں گے اور دوسری طرف اپنے متبعین کی طرف سے اس قسم کی باتیں سُنیں گے تو کوشش کریں گے کہ اپنی ندامت کو چھپائیں (لیکن ایسا کر نہیں سکیں گے) ان کی گردنوں میں زنجیریں ڈال کر انہیں کشاں کشاں عذاب کی طرف لے جایا جائے گا اور یہ سب کچھ ان کے اپنے اعمال کا بدلہ ہوگا۔

اللہ ایسے انجام سے ہمیں محفوظ رکھے۔ آمین۔

خدا رے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

●

ہوائی فائرنگ

دنیا کی تقریباً ہر قوم خوشی کا اظہار ناچ گا کر یا شادیانے بجا کر کرتی ہے۔ کچھ لوگ میلوں ٹھیلوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ یورپ میں سڑکوں پر مختلف سوانگ بھرے لوگ گذرتے ہیں۔ عرب نیم دائرے کی شکل میں کھڑے ہو کر تلواریں اور بندوقیں لہراتے ہیں۔ پردیسی ملک بھارت میں مرد عورتیں مل کر ناچتے گاتے ہیں۔

مگر آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ دنیا میں ایک ایسی قوم بھی رہتی ہے جو خوشی کے موقعہ پر دوسرے کو موت کی نیند سلا دیتی ہے۔ آپ ضرور یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین ہوں گے کہ وہ کونسی قوم ہے جو خوشی کے موقعہ پر دوسروں کا خون بہاتی ہے۔ تو سُن لیجئے وہ ہے پاکستانی قوم۔

ان کے خوشی کے اظہار کا طریقہ یہ ہے کہ یہ بے گناہوں کا خون بہاتے ہیں۔ یہ مختلف قسم کے اسلحوں سے ہوائی فائرنگ کرتے ہیں۔

سرکاری رپورٹ کے مطابق صرف صوبہ سرحد میں سال ۱۹۹۳ء میں ۱۸۴ اشخاص ہوائی فائرنگ کا شکار ہوئے۔ وہ خوشی کیا خوشی ہوگی جس سے دوسرے کے گھر میں صفِ ماتم بچھ جائے۔

پچھلے دنوں پی ٹی وی پشاور سنٹر سے اس موضوع پر بات چیت ہوئی مگر نہ صحیح طور پر مرض کی نشاندہی کی گئی نہ علاج سوچا گیا۔ بلاشبہ یہ رسم بدسرحد سے چلی تھی اب پورے پاکستان میں پھیل گئی۔

پرانے زمانے میں جب ڈاکٹر اور آپریشن کی سہولت نہ تھی۔ کسی نئے شادی شدہ جوڑے کے ہاں پہلے بچے کی آمد ہوتی تھی۔ بغیر آپریشن کے ولادت تکلیف دہ حد تک پہنچ جاتی تھی۔ عورت کم سن یا کمزور ہوتی تھی دردِ زہ میں اس کا تڑپنا دیکھا نہ جاتا تھا۔ تو اس کا شوہر اپنے جگری دوست کو فائر کے لئے بلاتا۔ وہ اپنی قرابین[1] لیکر آتا۔ کانوں سے پگڑی لپیٹتا اور فائر کرتا۔ اندر صرف دایہ کو اس فائر کا علم ہوتا تھا۔ ناگہانی فائر سے اسے اپنے کام میں آسانی ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی شکل بدل گئی۔ اب بچہ پیدا ہونے کے بعد فائرنگ ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ ہر خوشی کے موقعہ پر فائرنگ کا رواج ہوا۔ اب حالت یہ ہے کہ بچہ پیدا ہونے پر فائرنگ، ختنہ پر فائرنگ، سکول اور پھر کالج میں داخلے پر فائرنگ، دوبئی کے ویزے پر فائرنگ، وہاں سے پہلے ڈرافٹ آنے پر فائرنگ، منگنی بیاہ شادی پر فائرنگ، الیکشن میں کامیابی پر فائرنگ۔ یہ تو ہوا فائرنگ رائج ہونے کا قصہ۔ سوال یہ ہے کہ پنپ کیسے گیا؟ اس کا ایک ہی جواب ہے۔ الناس یمشون علیٰ خطوط الکبار لوگ چلتے ہیں بڑوں کے نقشِ قدم پر۔ ہمارے بڑے یہ سب کرنے لگے۔

پاکستان میں ایک مہینے میں جتنی فائرنگ ہوتی ہے اس سے ہم بہ آسانی کشمیر فتح کر سکتے ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں اس کے خلاف قانون بنا، نو ہزار روپیہ جرمانہ اور قید، پھر بھی اس رسمِ بد کا خاتمہ نہ ہوا۔ وجہ وہی کہ ایک سوداگر اشرفیوں کی تھیلی سر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ رات کو چور تھیلی اڑا لے گیا۔ سوداگر نے حاکمِ شہر کے پاس جا کر شکایت کی۔ حاکم نے کہا اگر تم نہ سوتے تو اشرفیاں نہ جاتیں۔ سوداگر نے کہا حضور میں اس لئے سو گیا تھا کہ آپ جاگ رہے ہیں۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ آپ بھی میری طرح سو رہے ہیں تو میں نہ سوتا۔

---

[1] قرابین بندوق کی طرح ہتھیار ہوتا ہے۔ اس میں بارود گز کے ذریعے ٹھونسا جاتا ہے۔ آواز بڑی زوردار ہوتی ہے۔ مُنہ بقیہ نال سے بڑا ہوتا ہے، شہنائی کی طرح۔ چرچل نے اپنی سوانح میں اس کا ذکر کیا ہے۔ بونیر کی جنگ میں اس نے اس ہتھیار سے بڑا نقصان اٹھایا ہے۔

تو عرض یہ ہے کہ ہماری پولیس بہری نہیں، وہ سماعت کی طاقت رکھتی ہے۔ مگر سو رہی ہے۔ تم جانو سویا اور مرا ہوا تو ایک برابر ہوتے ہیں۔ اس کا علاج ممکن ہے۔ بلدیاتی ممبر یا کونسلر وغیرہ، کمشنر کے پاس جائے اور کہے گذشتہ رات ہمارے ہاں شادی میں فائرنگ ہوئی تھی مگر کوئی پکڑائی نہیں ہوئی۔ کمشنر متعلقہ تھانے کو بیس ہزار روپیہ جرمانہ اور تھانے دار کو ایک سال کے لائن حاضر کر دے۔ دیکھیں کس طرح اس رسمِ بد کا خاتمہ نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر عبدالودود صاحب سے رابطہ کے لئے ان کا موجودہ پتہ نوٹ فرمائیے۔
17۔ ایل سول لائنز، جوہر آباد ضلع خوشاب

پمفلٹس

ماہنامہ طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۹۴ء میں ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے اب تک جاری کردہ پمفلٹس کی فہرست دی گئی تھی۔ قارئین نے ان میں سے جن پمفلٹس کی فرمائش کی ہے ان میں سے مندرجہ ذیل پمفلٹس اس وقت زیرِ طباعت ہیں۔

بزبانِ انگریزی

(1) GENESIS AND IDEOLOGY OF PAKISTAN.

(2) ECONOMICS IN THE SOCIAL STRUCTURE OF ISLAM.

(3) ISLAMIC IDEOLOGY. (4) IS ISLAM A FAILURE?

بزبانِ اُردو

(۱) اسلامی قوانین کے راستے میں کون حائل ہے۔

(۲) دنیا نظامِ محمدیؐ کے لئے بیتاب ہے۔

(۳) کیا ہم آزاد ہیں؟ (۴) اسلامک آئیڈیالوجی

جونہی یہ پمفلٹس شائع ہوئے انہی صفحات میں قارئین کو اطلاع کر دی جائیگی۔

چیئرمین ادارہ

صُبحِ بہار

جب زمین گرمی کی شدت سے تمتما اٹھتی ہے۔ تمازتِ آفتاب اس کی رگ رگ سے نم زندگی چوس لیتی ہے آسمان کی شعلہ ریزیاں ساری فضا کو دہکتا ہوا انگارہ بنا دیتی ہیں۔ بادِ سموم کی ہلاکت سامانیاں تازگی و شگفتگی کی ہر نمود کو جھلس ڈالتی ہیں۔ پھول مرجھا جاتے ہیں۔ شگوفوں کی گردن کے منکے ٹوٹ جاتے ہیں۔ لالہ کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ پتیاں سوکھ جاتی ہیں۔ شاخیں پژمردہ ہو جاتی ہیں۔ لہلہاتی کھیتیاں خشک ہو جاتی ہیں۔ سرو و صنوبر آتشِ ارضی کے دود کش دکھائی دیتے ہیں۔ تابندہ چشمے دیدۂ کور کی طرح بے نور ہو جاتے ہیں۔ مرمریں ندیاں خطِ تقدیر محکوماں کی طرح بے آب رہ جاتی ہیں۔ لُو کی دہشت سے سارے کانپتے ہیں۔ راستے ہانپتے ہیں۔ خنکی غاروں میں مُنہ چھپا لیتی ہے ٹھنڈک سہم کر کنوؤں میں جا دبکتی ہے۔ دفورِ تپش سے سینۂ کائنات میں سانس رُکنے لگتی ہے۔ جنگل کے جانور آسمانی شعلوں کی لپیٹ سے کہیں پناہ نہیں پاتے۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں نرم و نازک زبانیں نکالے نڈھال ہو کر پڑ جاتے ہیں۔ طائرِ نگاہ تک بھی کاشانۂ چشم میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ انسان، زندگی اور اس کی تمام لطافتوں سے مایوس ہو جاتا ہے۔ سوختہ بخت کسان کھیت کے کنارے کھڑا للچائی ہوئی نظروں سے آسمان کی طرف تکتا ہے کہ کہیں سے اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان دکھائی دے، لیکن اس کی خاسر و نامراد نگاہیں حسرت بن کر اس کے ویرانۂ قلب میں لوٹ آتی ہیں۔ اس طرح جب حیاتِ ارضی کے کسی گوشے میں بھی امید کی نمی باقی نہیں رہتی اور بساطِ کائنات کے کسی کونے میں بھی زندگی کی کوئی تازگی دکھائی نہیں دیتی تو یاس و ناامیدی کے اس انتہائی عالم میں مبدأ فیض کی کرم گستری سے سحابِ رحمت کسان کی آنکھوں کا نور بن فضائے آسمانی پر چھا جاتا ہے اور اپنی جواہر پاشیوں اور گہر ریزیوں سے دامنِ ارض کو بھر پور کر دیتا ہے۔ زمین مردہ میں پھر سے زندگی آجاتی ہے۔ رگِ کائنات میں نبضِ حیات پھر سے متموج ہو جاتی ہے۔ فضا کے سینے میں رُکی ہوئی سانس پھر سے زندگی کی جوئے رواں بن جاتی ہے۔ چشموں کی خشک آنکھیں شرابِ زندگی کے چھلکتے ہوئے جام نور بن جاتی ہیں۔ ندیوں کی بے آب لکیریں۔ بادۂ جاں فزا کی مسیحا نفسی سے رگِ جان میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ دبکی ہوئی بروتیں، کنوؤں کی تہوں سے اچھل کر بساطِ ارض پر پھیل جاتی ہیں۔ خشک پتوں میں جان پڑ جاتی ہے۔ مرجھائے ہوئے پھولوں میں از سرِ نو تازگی و شگفتگی آجاتی ہے۔ شگوفے چٹکتے ہیں، کلیاں مہکتی ہیں، ٹھنڈی ہواؤں کے لطیف و نفیس جھونکے سرسبز و شاداب درختوں کی

شاخوں میں لچک اور پھولوں میں یوں جنبش پیدا کر دیتے ہیں گویا ــ بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں۔ ہر طرف ایک نئی زندگی اور ہر طرف ایک حیاتِ تازہ، جھومتی مسکراتی مچلتی ہوئی ایک ایسی جنت نگاہ بن جاتی ہے جس کی ہر روش میں مسرتوں کے چشمے اُبلتے اور ہر تختے میں قہقہوں کے پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ ط

(۴۲/۲۸)

اور یہ اللہ ہی کی ذات ہے جو ایسی نا امیدیوں کے بعد اپنے سحابِ کرم کو بھیجتی اور اس طرح اپنی بساطِ رحمت کو صفحۂ ارض پر بچھا دیتی ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ط (۷/۵۷)

اسی کی ذات ہے جو زمین کے جھلس جانے کے بعد ان ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کو بھیجتی ہے جو اس کے ابرِ کرم کی پیشوائی میں ایک حیاتِ نو کی بشارت دیتی ہیں پھر جب وہ ہوائیں پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو لے کر اڑتی ہیں تو خدا کا قانون انہیں زمینِ مردہ کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔ وہاں ان بادلوں سے پانی برستا ہے جس سے اسی زمینِ مردہ سے، ہر قسم کے پھول اور پھل پیدا ہو جاتے ہیں اور ہر طرف زندگی کی نمود ہو جاتی ہے۔

فَانْظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط (۳۰/۵۰)

پس اگر تم آنکھوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتے ہو تو اللہ کے ان آثارِ رحمت کو دیکھو اور غور کرو کہ وہ زمین کو اس کی موت کے بعد کس طرح حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔

یہ فطرت کا نظام ہے۔ یہ اس کا قانون ہے جس کے قوانین اٹل اور جس کے آئین غیر متبدل ہیں، یہ اس کا قاعدہ ہے جس کے قواعد و ضوابط میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی، کہ تبدیلیاں زمان و مکان کے تغیرات کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اس کی ذات زمان و مکان کی قیود سے ماوراء اور ان کے اثرات سے بے نیاز ہے۔

لیکن ان مادی تشبیہات و استعارات سے ہٹ کر ذرا دنیائے انسانیت کی طرف آئیے اور دیکھئے کہ وہاں بھی یہی اصولِ فطرت کس طرح عمل پیرا ہے۔ یہ مادی تشبیہات و استعارات بھی درحقیقت اسی مقصد کے لئے بیان کئے جاتے ہیں کہ انسان ان محسوسات کی راہوں سے مجرد حقیقتوں کی طرف آئے اور جو کچھ عالمِ آفاق میں ہو رہا ہے اس سے عالمِ انفس پر دلیل لائے۔ گذشتہ اوراق میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ آج سے چودہ سو سال پیشتر دنیائے

انیت کی کیا کیفیت ہو چکی تھی۔ تاریخ کی یادداشتیں اس پر شاہد ہیں کہ اس وقت عالمِ انسانیت کی خشک سالی اس سے کہیں زیادہ شدید مہیب تھی جس کا تشبیہی منظر اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ اس وقت شجرِ زندگی کی شاخ شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے پھول وحشت و بربریت کی بادِ سموم سے مرجھا چکے تھے۔ حسنِ عمل کے زندگی بخش چشمے یکسر خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جوہرِ انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا کہیں نشان تک باقی نہ تھا۔ کشتِ مذاہب و اخلاق کے حدود تو باقی تھے، لیکن فصلیں بالکل اجڑ چکی تھیں۔ اس وحشت و سیمگی کے عالم میں، خاسر و نامراد انسان اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا تھا لیکن خدا کی اس وسیع زمین پر اسے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس و ناامید ہو کر اس کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی تھیں اور ایک پکار سننے والے کو پکار پکار کہتی تھیں کہ مَتٰی نَصرُ اللّٰہ! یہ وقت تھا کہ فطرت کے اس اٹل قانون کے مطابق جس طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، اس افسردگی و پژمردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا جاتا۔ چنانچہ اس کے لئے اس ربِ ذوالمنن کا سحابِ کرم، زندہ امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزار جنتیں اپنے آغوش میں لئے، ربیع الاوّل کے مقدس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر جھوم کر آیا اور بلد امین کی مبارک وادیوں میں کھل کھلا کر برسا جس سے انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ اخلاق و تمدن کے پژمردہ پھولوں پر پھر سے بہار آگئی۔ عمرانیت و مدنیت کے سبزۂ پامال میں نزہت و لطافت پیدا ہو گئی۔ اعمالِ صالحہ کے خشک چشمے حیاتِ تازہ کے جوئے رواں میں تبدیل ہو گئے۔ طغیانی و سرکشی کی بادِ سموم، عدل و احسان کی جاں بخش نسیمِ سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم مسرتوں کے نغموں سے گونج اٹھی۔ انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جھک کر زمین کو مبارک باد دی کہ تیرے بختِ بلند نے یاوری کی اور تیرے خوش نصیب ذرّوں کو اس ذاتِ اطہر و اعظمؐ کی پابوسی کی سعادت نصیب ہو گئی، جو عالمِ موجودات کے سلسلۂ ارتقار کی آخری کڑی ہے۔ جس سے شرف و مجدِ انسانیت کی تکمیل ہو گئی، جو علم و بصیرت کے اس افقِ اعلیٰ پر جلوہ بار ہے جہاں عقل و عشق، فکر و نظر، دین اور دنیا، قوسین کی طرح آپس میں ملتے ہیں۔ جو دانشِ نورانی و حکمتِ برہانی کے اس مقامِ بلند پر فائز ہے جہاں غیب و شہود کی وادیاں دامنِ نگاہ میں سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ ہاں تو، آسمان نے خوش بخت زمین کی بارگاہِ عالیہ میں جھک جھک کر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کیا تو اسی فطرت نے "جنت سے نکالے ہوئے آدم" کے اس طالعِ بیدار کا تقدیس و تحمید کے زمزموں سے استقبال کیا دنیا سے طاغوتی قوتوں کے تخت الٹ گئے کہ آنے والا آگیا۔ جس کی آمد ملوکیت و قیصریت کے لئے پیغامِ فنا تھی۔ ایران کے آتشکدوں کی آگ ٹھنڈی گئی گئی کہ اب سے انسانی تصورات کی دنیا نار کی جگہ نور سے معمور ہو گئی۔ دنیا کے صنم کدوں کے بت پاش پاش ہو گئے کہ آج مسلکِ ابراہیمی کی تکمیل کا دن آگیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں

جاکر مُنہ چھپالیا کہ اب جور و استبداد کی ہر طاغوتی قوت کے روپوش ہونے کا وقت آگیا۔ دنیا سے باطل کی تاریکیاں دُور ہوگئیں کہ آج اس آفتابِ عالمتاب کا طلوع ہوا جس کے بھیجنے والے نے اسے "جگمگاتا چراغ" کہہ کر پکارا اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ (۳۳/۴۵-۴۶) آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا کہ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۝ (۷/۱۵۷) جب وہ آیا تو اس نے ان تمام اغلال و سلاسل کو ایک ایک کرکے توڑ دیا جن میں انسانیت جکڑی چلی آرہی تھی۔ احبار و رہبان کی تقلید کے اطواق و سلاسل، قیصر و کسریٰ کے استبداد کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں، تقسیمِ انسانیت کے انسانیت کش نسلی، جغرافیائی، وطنی، غیر فطری معیار، سب ایک ایک کرکے ٹوٹتے چلے گئے اور پابندِ قفس طائرِ لاہوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں، اذنِ بال کشائی عطا ہوا اور انسان ایک مرتبہ پھر زمین پر سر اونچا کرکے چلنے کے قابل ہوگیا۔ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی۔ عقل کو عشق کا جنون اور عشق کو عقل کی فرزانگی عطا ہوئی۔ فقر کو شکوہِ خسروی اور پادشاہی کو استغنائے فاروقی عنایت ہوا۔ یہ تھی وہ ذاتِ گرامی کہ

اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى (۳۰/۵۰)

اس طرح وہ دلوں کی مردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔

اسی حقیقتِ باہرہ کو باندازِ دگر دیکھئے۔ آویزشِ ابلیس و آدم سے سلسلۂ رشد و ہدایت کی ابتدا ہوئی۔ ابلیسانہ قوتوں کی تائید میں کشش و جاذبیت کا وہ تمام نگاہ فریب سامانِ رنگ و تعطر تھا جو نگارخانۂ طلسم و جبروت کے دامن میں بھر کر رکھ دیا گیا تھا۔ دوسری طرف انسانی راہنمائی کے لئے پیغامِ ازلی تھا جو مبداءِ فیض کی شانِ ربوبیت سے انسانوں تک پہنچتا رہا۔ عقلِ خودبیں طبیعیاتی زندگی ہی کو سفرِ حیات کی آخری منزل قرار دے کر، اعلیٰ مقاصد اور بلند اقدار کو اس کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن یہ پیغامِ ازلی اس کے سامنے طبیعیاتی زندگی کی آرائشوں کے ساتھ ساتھ شرفِ انسانیت کی بلند حقیقتوں کو بے نقاب کرتا تھا۔ اس پیغام کی لِم ایک تھی، حقیقت ایک تھی۔ لیکن جوں جوں اس طلسم کدۂ رنگ و بو کی پیچیدگیاں بے نقاب ہوتی جاتی تھیں۔ اس تعلیم کی جزئیات میں مناسب ردّ و بدل اور ضروری تغیر و تبدل ہوتا جاتا تھا تاکہ طبعی ارتقا کے ساتھ ساتھ، جوہرِ انسانیت میں بھی بتدریج ارتقا ہوتا جائے۔ یہ ارتقائی مدارج تکمیل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رہروانِ شوق کا یہ کارواں سوئے منزل جادہ پیما تھا۔ ان پیغمبرانِ حیاتِ جاوید کا ہر ایک قدم ایک خاص سمت اٹھتا اور ہر نشانِ راہ ایک آخری مستقر کی طرف اشارہ کرتا جاتا۔ چنانچہ آنے والوں میں سے جو کوئی اپنے منصب کی

تکمیل کے بعد واپس جاتا تو جاتے وقت ایک آخری آنے والے کا پتہ نشان بتا کر جاتا، تاکہ جب وہ آنے والا آئے تو یہ قافلہ بلا تامل و توقف اس کے پیچھے ہولے اور راہ گم کردہ، مختلف وادیوں میں سرگرداں و حیراں نہ پھرتا رہے۔ اس لئے کہ یہ سب ایک ہی سلسلۂ زریں کی مختلف کڑیاں تھیں جن میں کی ہر کڑی، سلسلۂ آخری کڑی کی روشن دلیل تھی۔ یہ سب ایک ہی کتابِ فطرت کے اوراق و ابواب تھے جن میں کا ہر ورق اور ہر باب، کتاب کے آخری باب کی تمہید تھا۔ یہ سب ایک ہی شجرِ طیب کی شگفتہ شاخیں تھیں جو ایک گلِ سرسبد کے لئے نویدِ بہار تھیں۔

چنانچہ جب مشیتِ ایزدی کی یہ تدبیرِ محکم جس کے لئے زمین و آسمان قرنہا قرن سے یوں سرگرداں پھر رہے تھے، اپنی پختگی تک پہنچی۔ جب انسانیت جس کے لئے کائنات نے ایک ایک ذرّے کو لاکھوں چکر دیئے تھے، گہوارۂ طفولیت سے حریم شباب میں آگئی۔ جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آگیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی مرمریں روشنی میں کوثر و تسنیم سے دھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے تھے۔ جب سینۂ کائنات میں اتنی کشادہ پیدا ہوگئی کہ وہ اپنے اندر رازہائے درونِ پردہ کے معدنِ لعل و گوہر کو سمولے تو آسمان کی حوریں زمین پر اتریں کہ جنت کے تر و تازہ پھولوں سے وادیٔ بطحا کی تزئین و آرائش کریں۔ صحنِ گلستانِ کائنات پر بہار آگئی ہر طرف سے مسرتوں کے چشمے ابلنے لگے۔ چاند مسکرایا۔ ستارے ہنسے۔ آسمان سے نور کی بارش ہوئی۔ فرشتوں کی معصوم نگاہوں میں اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ کی تفسیر، ایک پیکرِ محبوبیت کا حسین تصور بن کر چمکنے لگی۔ فلک تعظیم کے لئے جھکا۔ زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ سے اٹھائی کہ آج اس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آپہنچا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرّے جگمگا اٹھے۔ بلدامین کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد تھی۔ جس کی طرف جبل تین پر حضرت نوحؑ نے اشارہ کیا تھا اور جسے کوہِ زیتون پر حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجۂ تسکینِ خاطر بتایا تھا۔ جس کی آمد کی بشارتیں وادیٔ طورِ سینین میں بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں اور جس کے لئے دشتِ عرب میں حضرت خلیل اکبرؑ اور ذبیح اعظمؑ نے اپنے خدا کے حضور دامن پھیلایا تھا، وہ آنے والا کہ جس کے انتظار میں زمانہ نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں، آیا اور اس شانِ زیبائی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی حدود فراموش شاخوں نے جھولا جھلایا۔ ملاءِ اعلیٰ کی مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرّے چمک اٹھے۔ فضائے عالم صلوٰۃ و سلام کی فردوشِ گوش صداؤں سے گونج اٹھی اور انس و جان وجد و کیف کے عالم میں پکار اٹھے کہ یہ آنے والا رسول کافۃ للناس اور رحمت للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی، اسی کتابِ مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمدؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام پر تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی

کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمن کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبیٔ آخر الزماںؐ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ و تابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے، یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے، یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں یہ پھول تھا۔ وہ ذرّے تھے، یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے، یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے، یہ ملّت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتدا تھی، یہ انتہا تھا۔

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا، شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (۳۳/۵۶)

پرویز صاحبؒ کی مایہ ناز کتاب معراجِ انسانیت سے ماخوذ۔ پرویزؒ

حدیثُ النّبیؐ

بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کو نفع پہنچائے۔ (رواۃ البخاری)

سلیم رانا، ڈنمارک

توحیدِ خالص

بلاشبہ دنیا میں سب سے پہلا گھر جو خالص انسانیت کی خاطر بنایا گیا وہ مکہ میں ہے۔ اپنے مقام پر محکم اور نوعِ انسانی کی نشوونما کا حامل، تمام اقوامِ عالم کے لئے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے راہ نمائی کا ذریعہ۔" (۳/۹۵)

مکہ کی بے آب و گیا وادی میں جہاں انسانی سکونت اور اقامت کے لئے کوئی جاذبیت نہ تھی۔ وہاں بیت اللہ کا سنگِ بنیاد حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ جیسے توحید پرست کے مقدس ہاتھوں نے رکھا اور حضرت اسمٰعیلؑ جیسے پیکرِ ایثار اور صداقت نے مٹی اور پتھر اپنے سر پر اٹھایا۔ ان کے ہاتھ کام میں مصروف تھے اور لبوں پر حسین دعائیں مچل رہی تھیں۔

"اے الٰہ العالمین! تیرے یہ ناچیز بندے تیرے مقدس نام پر اس کی دیواریں کھڑی کر رہے ہیں، ان کی اس حقیر محنت کو شرفِ قبولیت عطا فرما۔ بلاشبہ تو دعاؤں کا سننے والا اور نیتوں کا جاننے والا ہے۔" (۲/۱۲۷)

"اے پروردگار! ہمیں ایسی توفیق عطا فرما کہ ہم تیرے سچے مسلم (تیرے قوانین کے پابند، تیرے احکام کے سامنے جھک جانے والے) بن جائیں اور ہماری نسل میں سے بھی وہ لوگ پیدا ہوں جو صحیح معنوں میں مسلم ہوں۔ تو ہمیں وہ طور طریق سکھا دے جن سے ہم اس مقصدِ عظیم کے حصول میں کامیاب ہو جائیں اور تیری عنایات کا رُخ ہماری طرف رہے۔ اس لئے کہ تیرا ہی قانون وہ قانون ہے کہ جہاں کسی نے اس کی طرف رُخ کیا، وہ تمام سامانِ رحمت کو اپنے ساتھ لئے خود اس کی طرف بڑھ کر آ گیا۔" (۲/۱۲۸)

"یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہے تا آنکہ ان میں انہی سے اس دعوتِ انقلاب کو لیکر وہ رسول اُٹھ کھڑا ہو جو تیرے ضابطۂ قوانین کو لوگوں کے سامنے پیش کر دے، انہیں اس کی تعلیم دے اور یہ بھی بتا دے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا نکلے گا اور وہ نظام متشکل

کر دے جس سے ان کی صلاحیتوں کی برومندی ہوتی رہے' تیرے اس قانون کے ذریعہ جو قوت اور حکمت' دونوں کا مجموعہ ہے۔" (۲/۱۲۹)

یہ وہ حسین اور مقدس دعائیں تھیں کہ اِدھر زبان سے ادا ہوئیں اور اُدھر شرفِ قبولیت سے ہم آغوش ہو گئیں۔ انہیں آرزوؤں اور تمناؤں میں اللہ کے اس گھر کی تعمیر عمل میں آئی۔ جب یہ مکمل ہو گیا تو ارشادِ باری تعالیٰ ہوا کہ

"اب' تم لوگوں میں اعلان کر دو کہ وہ حج کے لئے یہاں آیا کریں۔ دنیا کے دور دراز گوشوں سے لمبی لمبی مسافتیں طے کرتے پا پیادہ یا ایسی سواریوں پر جو سفر کی مشقت سے تھک کر چور ہو جائیں۔ وہ یہاں اس لئے آئیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام' ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ ہم نے جو مویشی انہیں دے رکھے ہیں' انہیں اللہ کا نام لے کر اس اجتماع کے مقررہ دنوں میں ذبح کریں' ان کا گوشت خود بھی کھائیں اور تکلیف زدہ محتاجوں کو بھی کھلائیں۔" (۲۲/۲۷ - ۲۸)

راقم الحروف بھی اس اعلان کی پیروی میں "لَبَّیْکَ" کہتے ہوئے جون ۹۱ء میں کشاں کشاں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی مقدس سرزمین جس کی فضاؤں میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی دعائیں گونج رہی ہیں اور اس کی خاک کے ذرات میں حضور پر نور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی پا بوسی کی سعادتیں جھلک رہی ہیں' میں حج کی سعادت حاصل کرنے کے لئے پہنچا تھا۔ حج کے سالانہ عظیم الشان اجتماع میں شمولیت سے پہلے عمرہ ادا کیا اور ۸ ذی الحجہ تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہ کر پروانہ وار اللہ کے کوٹھے کا طواف کرتے رہے اور مروجہ عبادت میں مصروف رہے۔

۸ ذی الحجہ' یوم الترویہ کو سورج نکلنے کے بعد مکہ مکرمہ سے منیٰ پہنچے۔ (منیٰ کو دو سو سوں کا شہر بھی کہتے ہیں) بڑی بڑی عمارتوں کے ساتھ ہی حرم سے قربان گاہ تک ایک وسیع اور کشادہ شیڈ بنا ہوا ہے جس میں وقفے وقفے کے بعد نہانے دھونے اور رفع حاجت کا بے نظیر انتظام ہے۔ خورد و نوش کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ بھی موجود ہے۔ سارا شیڈ ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ اس کی دونوں اطراف یکساں قسم کے خیمے نصب ہیں۔ ان میں بھی نہانے دھونے کے لئے پانی کی فراوانی ہے۔ دن اور رات یہاں گزارا اور صبح ۹ ذی الحجہ جو کہ جمعہ تھا' کو سورج طلوع ہوتے ہی منیٰ چھوڑ کر میدانِ عرفات میں جمع ہو گئے اور دیکھتے دیکھتے قریب ۴۰ لاکھ' دنیا کے دور دراز گوشوں سے آئے ہوئے فرزندانِ توحید کا ایک شہر آباد ہو گیا۔ نیم کے درختوں نے' جن میں پانی کے فوارے پھوٹتے ہیں' عرفات کے موسم میں بہت حد تک تبدیلی پیدا کر دی ہوئی ہے۔ دوپہر کے بعد مسجد نمرہ سے خطبہ پڑھا گیا جو عربی میں تھا۔ اسی میدان میں ۱۰ھ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کا خطبہ ارشاد فرمایا تھا جو قیام نوعِ انسانی کے لئے منشورِ بالغہ ہے۔ اس وقت ایک لاکھ قدسیوں کے تکبیر کے غلغلہ انگیز نعروں سے فضا جو مرتعش ہوئی تھی' اس کا ارتعاش آج

...س کیا جاتا ہے۔ ان سب نے اس خطبہ کو جذب کر کے اس پر عمل کر کے ثابت کر دیا کہ " سمعنا و اطعنا"
...ہے۔ مگر ہم تو صرف رسمِ وفا کی خاطر حج کی سند حاصل کرنے کے لئے وہاں جمع ہوتے ہیں۔ اتنے بڑے
...ع پر مشتمل مشین آج کسی قسم کا نتیجہ پیدا کرنے سے قطعی قاصر ہے ۔ اس قدر عدیم النظیر، یکساں ملبوس
...ع اگر امام کے ساتھ، دل کی گہرائیوں سے، یک زبان صرف آمین ہی کہیے، تو اس سے پیدا ہونیوالا ارتعاش
ستاروں کو ان کے مدار سے نکالنے کی قوت کا حامل ہو سکتا ہے۔ میدانِ عرفات میں اس سالانہ حاضری سے کیا
مراد تھی اور اب کیا رہ گئی ہے۔ اس حقیقتِ ثابتہ کو رسومات نے ظلمات کے دبیز پردوں تلے دبا رکھا ہے۔

شام، یعنی مغرب کے وقت عرفات چھوڑ کر مزدلفہ کو روانہ ہوئے۔ رات وہاں گزاری اور ستر (۷۰) کنکریاں
چنی گئیں اور صلوٰۃ فجر ادا کر کے واپس منیٰ کے لئے روانہ ہوئے۔ "مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان ایک وادی پڑتی
ہے جسے وادیٔ محسر کہتے ہیں، اسی وادی میں حاکمِ یمن، ابراہہ، کعبہ مسمار کرنے کے مذموم ارادے سے ہاتھیوں سے
پر مشتمل ۶۰ ہزار کے لشکرِ جرار کے ساتھ خیمہ زن ہوا تھا۔" منیٰ میں یہ ۱۰ ذی الحجہ ہے اور آج صرف شیطانِ
بزرگ (جمرۃ العقبہ) پر سات کنکریاں برسائی ہوتی ہیں۔ ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ کو تینوں شیطانوں پر کنکریاں برسائی گئیں۔
حیرت و استعجاب کا مقام ہے کہ پوری دنیا سے آیا ہوا مسلمان، اس وادیٔ محسر میں پتھر اور مٹی سے کھڑے کئے ہوئے
ستونوں کو شیطان تصور کر کے ان بے جان پتھروں پر کنکریاں برسا کر شیطنت سے محفوظ سمجھتا ہے۔ حالانکہ قرآنِ کریم
کے مطابق شیطان یا ابلیس کا انسان سے الگ خارج میں کوئی وجود ہی نہیں بلکہ یہ سراسر انسان ہی کی ایک خصلت
یعنی سرکش جذبات کا نام ہے۔ ابلیس (انسان کے اپنے سرکش جذبات) نے کہا تھا کہ،

"تیرے غلبہ و تسلط کی قسم، تو دیکھ کہ میں انسانوں کو کس طرح تیرے صحیح راستے سے بہکاتا
ہوں۔ بجز تیرے ان بندوں کے جو "ہجوم سے ہٹ کر تیرے قانون کا اتباع کریں۔"

(۳۸/۸۲ ــ ۸۳)

قرآنِ کریم کی اس روشن وضاحت کی موجودگی میں یہ کس طرح ممکن ہو سکتا کہ "توحیدِ خالص" کے علمبردار حضرت ابراہیمؑ
جن کے متعلق قرآنِ کریم سند دے رہا ہے کہ "وہ اپنی شخصیت میں ایک پوری امت تھا اور ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا"
(۱۶...) کو بیٹے کی قربانی سے ورغلانے کے لئے شیطان سامنے آیا اور وہ بھی تین بار ـــ اور یہ عقیدہ کہ حضرت ابراہیمؑ
چھری چل گئی تھی مگر حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ ایک بھیڑ ذبح ہوئی، کے تحت ہر سال منیٰ کی قربان گاہ کے علاوہ دنیا
...ملک میں جانور اسی قربانی کے تصور کے تحت ذبح ہو رہے ہیں۔ شیطانوں کے بارے میں ممتاز مفتی نے اپنی تصنیف
...لبیک" میں ایک بڑے میاں کے حوالے سے لکھا ہے کہ منیٰ وہ جگہ ہے جہاں ابلیس نے حضرت ابراہیمؑ کو تین بار
...نے کی کوشش کی تھی۔ جب وہ حضرت اسمٰعیلؑ کی انگلی تھامے اس راستے پر جا رہے تھے تاکہ بیٹے کو اللہ کی رضا

پر قربان کر دیں۔ اس وقت ابلیس نے ان کے دل میں وسوسے پیدا کرنے کی کوشش کی تھی کہنے لگا "چھوڑیئے صاحب، بیٹے کی قربانی دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اللہ کو قربانی کی کیا ضرورت ہے"۔ تین مقامات پر ابلیس نے حضرت ابراہیمؑ کے یقینِ محکم کو توڑنے کی کوششیں کیں۔ جب ان کا ایمان متزلزل نہ ہوا تو ابلیس نے ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو ورغلایا "تمہارا باپ تو دیوانہ ہے جو اپنے لختِ جگر کا گلا کاٹنے کے لئے قربان گاہ کو لئے جا رہا ہے۔ کوئی صاحبِ عقل و دانش ایسا کام کر سکتا ہے۔ کیا تمہارے والد کا ذہنی توازن خراب ہو چکا ہے۔ بھاگ جاؤ۔ ہاتھ چھڑا کر اس دیوانے سے دُور بھاگ جاؤ۔ بھاگ کر اپنی جان بچا لو ورنہ ..... ! ٹھیک کہا ہے قرآنِ کریم نے کہ:

"ان میں کچھ تو ایسے ہیں کہ قوانینِ خداوندی سے یکسر انکار کر دیتے ہیں اور اکثر ایسے ہیں کہ وہ خدا کے قانون کو مانتے تو ہیں لیکن اس کے ساتھ اور قوتوں کو بھی صاحبِ اقتدار و اختیار تسلیم کرتے ہیں اور اس طرح مومن کہلانے کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں"۔

(۱۲/۱۰۶)

بہرکیف مروجہ طریقہ کار کے مطابق دسویں ذی الحجہ کو مزدلفہ سے واپسی پر شیطانِ بزرگ پر سات کنکریاں برسا کر بیت اللہ میں جا کر طواف افاضہ کیا اور واپس منیٰ پہنچ گئے۔ ۱۱ اور ۱۲ کو تینوں شیطانوں پر کنکریاں برسانے کے علاوہ منیٰ میں بس بیکار پڑے رہے۔ ۱۳ ذی الحجہ کو پتھر کے تینوں ستونوں پر کنکریاں برسا کر مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ کعبہ کا طواف کیا اور شکرانے کے نوافل ادا کئے۔ ہمارا حج مکمل ہو گیا۔ ابھی حضور پر نور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر جو تین سو میل دُور ہے، میں حاضری دینی ہے۔ اس حاضری کے لئے مذہب نے شرط عائد کر رکھی ہے کہ حج کی تکمیل کے لئے مسجد نبوی میں چالیس (۴۰) نمازیں باجماعت ادا کی جائیں۔ تاہم راقم الحروف کے نزدیک حج ہو یا عمرہ، اسی ہستیٔ بزرگ تر جس نے اپنی تیئس (۲۳) سالہ عملی زندگی سے خدا کا صحیح تصور پیش کیا، کے حضور حاضری محض ضروری ہی نہیں بلکہ لازمی ہے ــــ لہٰذا راقم الحروف طوافِ وداع کرنے کے بعد رات کو مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوا۔ مدینہ پہنچ کر حضور نبی کریمؐ کے روضہ مبارک پر خاموش مگر متلاشی نگاہوں اور دل کی گہرائیوں سے سلامِ عقیدت پیش کیا۔ آٹھ دن، پنجگانہ مسجدِ نبوی میں حاضری دی اور ہر صبح نماز فجر کے بعد پا پیادہ مسجد الاحرام کے بعد پہلی قائم ہونے والی مسجد، مسجدِ قبا میں بھی حاضری دی۔ راستہ میں بنی سالم کا محلہ بھی پڑتا ہے جہاں حضور نبی کریمؐ نے جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ مسجد قبلتین، جو مسجد نبوی سے تین میل دُور ہے، اپنے محل وقوع اور ترتیب و تعمیر کے لحاظ سے میرے لئے بہت بڑا سوال بن گئی۔ ملوکیت نے اپنی بقا کی خاطر عالمگیر دینِ اسلام کو معتقد التباسیت کی نذر کر کے مذہب اسلام حاصل کر لیا۔

یہ تھی تمہید اس حقیقت کی، جس کا عرفان راقم الحروف کو ۲۰ دسمبر ۱۹۹۳ء کو ہوا تھا۔ ہوا یوں، میرے ایک شاعر

... قبال اختر نے عمرہ کی سعادت کا شرف حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا جس نے مجھ میں بھی مقاماتِ مقدسہ ... کا بے پناہ اشتیاق پیدا کر دیا۔ میں نے اس اظہار کو عملی صورت دے کر تمام انتظامات مکمل کر دیئے۔ اس ... چلتے ہی ہمارے دیرینہ دوست خالق مرزا بھی ہمارے ساتھ ہو گئے لیکن مرزا صاحب نے کہا کہ عمرہ کے لئے احرام مدینہ منورہ سے باندھیں گے۔

جانِ حیات کی مسافرت پر روانہ ہونے والا یہ تین رکنی کاروانِ شوق ۱۹ دسمبر ۱۹۹۳ء کو جب کوپن ہیگن کے ہوائی مستقر پر پہنچا تو اراکین بزمِ فکرِ نو اور دیگر دوست احباب آنکھوں میں محبت کی قندیلیں روشن کئے چشم براہ تھے۔ بیوی بچوں اور دوست احباب سے وداع ہو کر یہ کاروانِ شوق ترک ہوا یولاری کے بوئنگ پر سوار ہو گیا جو ۱½ بجے سرزمینِ ڈنمارک چھوڑ کر ۱۰ ہزار میٹر کی بلندی اختیار کرتے ہوئے استنبول کی طرف گامزن ہو گیا۔ دو گھنٹے استنبول رکنے کے بعد ایئر بس نے ہمیں انقرہ پہنچا دیا جہاں عمرہ کی سعادت حاصل کرنے والے ترک ایئر بس کا وفورِ شوق سے منتظر تھے۔ ان ترکوں کو لے کر ایئر بس نے ہمیں ½۱ بجے صبح ۲۰ دسمبر ۱۹۹۳ء کو جدہ پہنچا دیا۔ سرزمینِ حجاز کا یہ شہر ایک مکمل تاریخ کا حامل ہے۔

جدہ ایئرپورٹ پر ٹیکسی ڈرائیوروں کی رسہ کشی کے باعث ہمارے تین گھنٹے ضائع ہو گئے۔ حکمتِ عملی کو بروئے کار لانے سے ہم جدہ بس اسٹیشن پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ مدینہ منورہ کے لئے پہلی بس ۷:۳۰ بجے چلنی تھی لہٰذا کوئی دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ خیر سعودی عرب پبلک ٹرانسپورٹ کی بس ہمیں لے کر مدینہ منورہ کو روانہ ہوئی۔ تھکاوٹ اور بس کی سبک رفتاری سے غنودگی طاری ہونے لگی کہ ساتھ بیٹھے ہوئے عرب نے کچھ کہا اور کہتا رہا، جب تک مجھے اس کے کہنے کی کچھ نہ کچھ سمجھ آنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ سفر کے دوران اونگھنا نہیں چاہیئے بلکہ ہمسفر کے ساتھ بات چیت کرنی چاہیئے۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ سارے راستے کے مناظر آنکھوں میں جذب کر لینے کے قابل ہیں۔ وقفے وقفے کے بعد وہ باتیں کرتا رہا تو مجھے واقعی اپنے گونگا ہونے کا بُری طرح احساس ہوا اور یہ بھی کہ عربی کوئی مشکل زبان نہیں۔ آبادی کے آثار نظر آنے لگے تو اس نے بڑے ادب سے "مدینہ منورہ" کہا اور مجھے کہا کہ ہوشیار ہو کر بیٹھو ــــ اور چند لمحوں کے بعد اس نے کہا ــــ "حرم" اس آواز "حرم" نے میری روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ــــ اچانک ہی بجلی کا ایک کوندا لپکا ــــ اور حقیقتِ توحید عیاں ہو گئی۔

جب زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی پیکرِ انسانی میں پہنچی اور مشیت کے پروگرام کے مطابق وہ وقت آیا کہ انسان اپنے سے پہلی آبادیوں کی جگہ زمین میں آباد ہو، تو کائناتی قوتوں (ملائکہ) کو اس پر تعجب ہوا۔ اس لئے اس سے پہلے کائنات میں کوئی ایسی مخلوق نہ تھی جسے قوانینِ خداوندی سے مجالِ سرتابی ہو۔ لیکن اس جدید مخلوق (انسان) کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا جا رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی بھی کر سکتا تھا۔

چنانچہ انہوں نے عرض کیا کہ بارِ الٰہا! یہ کس قسم کی مخلوق ہے جسے اب زمین میں بسایا جا رہا ہے؟ یہ تیرے قانون سے سرکشی برتے گا جس کا نتیجہ ناہمواریاں اور خون ریزیاں ہوگا۔ اس کے برعکس ہم میں جو فرائض ہمارے سپرد کئے گئے ہیں ہم ان کی سرانجام دہی میں ہمیشہ سرگرم عمل رہتے ہیں اور پروگراموں کو وجہ حمد و ستائش بنانے کے لئے جہاں تک جانا پڑے، جاتے ہیں۔ اس پر خالق کائنات نے کہا کہ ہمارے اس جدید پروگرام کو تم نہیں سمجھ سکتے۔ ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں۔

اس جدید مخلوق کے لئے تمام کائناتی قوتیں (ملائکہ) مسخر کر دی گئیں لیکن ایک ایسی قوت (ابلیس) بھی تھی جو اس کے عالم النفس میں ہے جس کو دیگر کائناتی قوتوں کی طرح مجبور نہیں پیدا کیا گیا تھا، نے اس کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اب انسان کا کام یہ ہے کہ اس سرکش قوت کو مسخر کر کے اپنی عقل و بصیرت سے کارگہ کائنات پر غور و تدبر کرے اور یہ دیکھے کہ کائنات کی ہر شے کس طرح قوانینِ خداوندی کے مطابق نہایت حزم و احتیاط، کمالِ مستعدی اور فرمانبرداری کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔ لہٰذا ایسا ہی ایک نظام انسانوں کی دنیا میں کارفرما ہونا چاہیئے۔ اس لئے انسان کی راہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا۔

اس رشد و ہدایت کی ابتدا حضرت نوحؑ سے ہوئی۔ قومِ نوح سرکش جذبات کے شعلوں کی حدت سے عقل و ہوش سے بیگانہ ہو رہی تھی۔ حکومت و سطوت، دولت و ثروت اور حسب و نسب کے نشہ میں کمزور اور ناتواں افراد معاشرہ پر بیجا ظلم و ستم کر رہی تھی۔ انبیائے کرامؑ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ ابلیسی خصلت کے حامل انسانوں کے جور و استبداد سے چھڑا کر براہِ راست قانونِ خداوندی کی اطاعت میں لے آئیں اور نظامِ خداوندی (نظامِ ربوبیت) کو متشکل کریں۔ لیکن یہ سلسلۂ ابلیسی خصائل کی حامل قوموں کی تباہی پر منتج ہوتا رہا۔

کسی خطۂ زمین پر کوئی شخص اپنی من مانی کی حکومت قائم نہیں کر سکتا جب تک وہاں کے لوگوں کو کسی تصوراتی قوت سے مرعوب نہ کر دیا جائے۔ اور ایسا کرنے کے لئے پیشوائیت کا حربہ نہایت کارگر ثابت ہوتا ہے۔ بابل اور نینوا کے مطلق العنان حکمران "نمرود" کی مطلق العنانی کو برقرار رکھنے کے لئے وہاں کے بڑے بتکدہ کا بڑا پجاری آذر لوگوں کو بت پرستی میں مشغول رکھتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی بعثت اسی آتشیں ماحول میں ہوئی۔ آپ نے اس آتشیں ماحول کو توحید کی بادِ نسیم سے خوشگوار بنانے کے لئے توحیدِ خالص کا علم بلند کیا جس سے نمرود اور آذر قصہ پارینہ ہو گئے۔

توحید ہی کی خاطر آپ نے خواب کو سچا کر دکھانے کے لئے بیٹے کو قربان کر دینا چاہا لیکن اس حکمِ الٰہی سے مقصود کچھ اور تھا۔ قرآن بتاتا ہے کہ "ہم نے ایک بہت بڑی قربانی کے لئے اسمٰعیلؑ کو بچا لیا" (۳۷/۱۰۷)۔ یہ "عظیم قربانی" یہ تھی کہ ملک شام کی سرداری کے بجائے ہم اس کے سپرد اس گھر کی پاسبانی کرنے والے تھے جو عرب کی بے برگ و گیا زمین میں واقعہ ہے اور جسے دنیا بھر کے توحید پرستوں کا مرکز بننا تھا (۱۴/۳۷)۔

بنو اسمٰعیلؑ کچھ عرصہ تک رشد و ہدایت پر کاربند رہی، پھر آہستہ آہستہ اس تعلیم میں تحریف و الحاق شروع ہوگیا۔ حتّٰی کہ بتانِ آذری نے کعبۃ اللہ کو مستور کر دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ بھی دعا کی تھی کہ:

"یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہے تا آنکہ ان میں" انہی میں سے" اس دعوتِ انقلاب کو لے کر وہ رسول اُٹھ کھڑا ہو جو تیرے ضابطۂ قوانین کو لوگوں کے سامنے پیش کر دے، انہیں اس کی تعلیم دے اور یہ بھی بتا دے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا نکلے گا۔ اور وہ نظام متشکل کر دے جس سے ان کی صلاحیتوں کی برومندی ہوتی رہے تیرے اس قانون کے ذریعہ جو قوت اور حکمت دونوں کا مجموعہ ہے..." (۲/۱۲۹)

بنو اسمٰعیل کی بارہ شاخیں تھیں۔ ایک شاخ بنو قیدار پھیلتے پھیلتے وسیع خاندانوں میں منقسم ہوئی۔ ان میں قریش کا خاندان نہایت معزز اور ممتاز ہوا۔ قریش میں سے ہاشم خصوصی شہرت کا حامل سردار تھا۔ اس کا بیٹا عبدالمطلب اپنے قبیلہ کا نامور سردار ہوا۔ ان کی زندگی کا نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے چاہِ زمزم، جو ایک مدت سے اٹ کر گم ہو چکا تھا، کا سراغ لگایا اور کھدوا کر اسے نئے سرے سے آباد کیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کی شادی قبیلہ زہرہ میں وہب بن عبدمناف کی صاحبزادی آمنہ سے کی جو قریش کے گھرانے میں ممتاز تھیں۔

اسی مکرم و ممتاز گھرانے میں، موسمِ بہار میں، دوشنبہ کے روز، بتاریخ ۹ ربیع الاوّل مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء بوقت صبح، اس نیّرِ عالمتاب کا طلوع ہوا جس سے (حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے مطابق) دنیا بھر کی تاریکیوں کو کافور ہو جانا تھا۔ حضور پُرنور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کا چالیسواں سال تھا کہ پہلی وحی نازل ہوئی ــــ یہ رات حدِ فاصل تھی، دنیائے قدیم، جو تاریکیوں میں لپٹی ہوئی، طلوعِ سحر کی منتظر تھی اور جہانِ نو میں کہ تمام نظامہائے کہن جو غیر فطری بنیادوں پر استوار تھے، باطل قرار پا گئے اور دنیا کو ایک نیا آئین عطا ہوا جس میں تکمیلِ شرفِ انسانیت کی تمام راہیں واضح طور پر سامنے آگئیں۔ وحی کے نزول کے بعد آپؐ پر انسانی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کا عظیم فریضہ عائد ہو گیا چنانچہ ندائے خداوندی نے پکارا اور کہا کہ:

"اے وہ کہ جس کے ذمہ دنیا کو سنوارنے اور جہانِ نو پیدا کرنے کا فریضہ عائد کیا گیا ہے۔ اُٹھ اور نوعِ انسانی کو غلط راستے پر چلنے کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دے اور اس حقیقت کا اعلان کر دے کہ کبریائی صرف خدا کے لئے ہے۔" (۷۴/۱-۴)

یہ تھا وہ انقلاب آفریں پیغام جسے عام کرنے کا فریضہ آپؐ پر عائد کیا گیا۔ اس سے پہلے وحی کی تعلیم خاص قبیلوں اور خاص قوموں تک محدود رہی تھی۔ لیکن جو تعلیم خدا کے اس آخری رسولؐ کے ذریعے دی گئی، اس کی مخاطب تمام نوعِ انسان تھی، اسے عالمگیر انسانیت کا ضابطۂ زندگی بننا تھا اور قیامت تک آنے والے انسانوں کی راہنمائی کا فریضہ ادا کرنا تھا۔ اس

ت کی ادائیگی کے سلسلہ میں فرمایا کہ،

"اے پیغمبر! تمام عالمگیر انسانیت کو مخاطب کر کے کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ اس خدا کا بھیجا ہوا رسول جس کا اقتدار تمام کائنات میں کارفرما ہے — (۷/۱۵۸) اور جب اللہ کا یہ بندہ اس دعوتِ خداوندی کو لے کر اٹھا تو مخالفین چاروں طرف سے یورش کر کے اسے لپٹ گئے" (۱۹/۷۲).

نظامِ خداوندی کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ خدا کے سوا، دنیا میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے پنا حکم منوائے، نہ ہی کسی انسان کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی انسان کو اپنا حکمران تسلیم کرے۔ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اربابِ حکومت، اربابِ دولت و ثروت، اربابِ مذہب، اربابِ طریقت، اربابِ حسب و نسب، یہ سب ل کر مخالفت اس لئے کرتے ہیں کہ ان سے اقتدار کی مسند، سرمایہ داری و مذہب کی خدائی مسند، خانقاہوں کی خلوتیں اور پیدائشی فضیلت، سب کچھ چھن جاتا ہے۔ ان کی حفاظت کے لئے یہ سب طاغوتی قوتیں تخویف و ترہیب استعمال کرتی ہیں۔ لیکن جب اس سے کام نہیں نکلتا تو ترغیب و تحریص پر اتر آتی ہیں۔ ابلیس نے آدم کو لالچ دے کر ہی جنت سے نکلوایا تھا۔ اس لئے کشمکش حق و باطل میں بیم و خوف سے کہیں زیادہ لغزش کے امکانات، طمع اور لالچ میں ہوتے ہیں۔ جہاں لوہے کی ہتھکڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں وہاں سونے کی زنجیریں کام میں لائی جاتی ہیں۔ حق و صداقت کی آواز کا گلا گھونٹنے کے لئے طلائی دستانے فولادی پنجوں سے کہیں زیادہ محکم گیر ہوتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کتنے ہی سینے تھے جو جاہ و دولت کے انسانیت کش زلزلہ سے دھڑکنے والے دلوں کے مدفن بن کر رہ گئے اور کتنی درخشندہ آنکھیں تھیں جو ریاست و سیادت کی برقِ خاطف سے "روزنِ دیوارِ زنداں" ہو گئیں۔

قریش ستم رانیوں اور ایذا رسانیوں سے تھک گئے تو انہوں نے بھی یہی حربہ استعمال کرنا چاہا۔ چنانچہ عتبہ بن ربیعہ، سردارانِ قریش کے نمائندہ کی حیثیت سے حضورؐ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! کیا چاہتے ہو؟
مکہ کی ریاست!
بڑے سے بڑے گھرانے میں شادی!! دولت کا انبار! جو کچھ مانگو تمہارے لئے حاضر ہے لیکن
اپنے اس مسلک کو چھوڑ دو۔

"اگر ایسا ہوتا کہ حق ان کی خواہشوں کی پیروی کرتا تو یقیناً آسمان و زمین اور وہ سب جو ان کے درمیان ہے یک قلم درہم برہم ہو جاتا۔ (لیکن ان کی اس جہالت پر ذرا غور کرو) ہم انہیں شرف اور عزت کا مقام عطا کرنا چاہتے ہیں اور یہ اپنے شرف و عزت سے اعراض برت

رہے ہیں۔" (۲۳/۷۱)

مخالفتوں کے ہجوم اور مزاحمتوں کے طوفان میں آپؐ کی یہ صوتِ سرمدی زندہ قلوب کو اپنی طرف کھینچنے میں مصروف تھی۔ یعنی اس مقناطیس کے ٹکڑے کی طرح جس سے فولادی ذرات' جو آہن گر کی فسان پر فولاد کے رگڑنے سے فسان کی ریت کے ساتھ نیچے گرتے ہیں' وہ تڑپ تڑپ کر ریت سے الگ ہو کر کہکشانی ستاروں کی طرح اس مقناطیسی ٹکڑے کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ حضورؐ میں بھی اسی قسم کا مقناطیسی اثر تھا' لہٰذا' وہ تمام منتشر ذرات جو اپنے اندر قبولِ کشش وجذب کی صلاحیت رکھتے تھے' اس مرکزِ حق وصداقت (آپؐ) کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے۔ یہی تھیں وہ سعید روحیں' جنہیں حضورؐ کی سربراہی میں مقامِ بلند پر پہنچ کر ساری دنیا کو جہانداری وجہانبانی کے آئین ودستور سے آگاہ کرنا تھا۔ اُدھر یمن میں سیلاب کی وجہ سے دو بھائی اوس اور خزرج ہجرت کر کے یثرب میں آباد ہوئے تھے اور فرخندہ اختر قبائل میں تبدیل ہو کر آسمانِ سعادت پر انصار کے درخشندہ ستارے بن چکے۔ ان میں سے چیدہ چیدہ سعید روحیں حج کے لئے مکہ مکرمہ آتی رہتی تھیں اور مشرف بہ اسلام ہو جاتی رہیں۔ انہوں نے حضورؐ سے خواہش ظاہر کی کہ کوئی معلم ان کے ساتھ بھیجدیا جائے۔ حضورؐ نے مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اس طرح یثرب میں تبلیغ وتلقین کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ اور کچھ عرصہ بعد حضورؐ نے صحابہ کبار کو اجازت دے دی کہ وہ آہستہ آہستہ اس دارالسلام کی طرف منتقل ہوتے چلے جائیں۔

مسلسل تیرہ برس توحید کے تحت نظامِ خداوندی کو متشکل کرنے کے لئے حضور نبی کریمؐ نے جو مصائب وشدائد جھیلے' تاریخ اس کی مثال نہیں دے سکتی۔ مکہ کی فضائیں جب توحید کی بادِ نسیم سے معطر ہو چکیں تو آپؐ کو ہجرت کی نوید دے دی گئی:

> "(مخالفین کی آخری سکیم یہ تھی کہ رسولؐ کو چپکے سے قتل کر دیا جائے لیکن) خدا کی اسکیمیں اتنی بلند وبرتر ہیں کہ وہ ان (مخالفین) کے قیاس وگمان میں بھی نہیں آسکتیں۔ چنانچہ خدا اپنی اسکیم کے مطابق اپنے بندے کو راتوں رات بیت الحرام (مکہ) سے مسجد اقصیٰ (یثرب) کی کشادہ سرزمین کی طرف لے گیا تاکہ اس دُور دراز مقام میں جا کر وہ نظامِ خداوندی کی تشکیل کرے۔ ہم نے اس مقام کو اور اس کے گرد وپیش کو بڑا بابرکت بنایا ہے۔ اس کی فضا اس آسمانی انقلاب کے لئے بڑی کارساز ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہے کہ خدا' اب ان باتوں کو آشکار کر دے جن کا وعدہ اتنے عرصہ سے کیا جا رہا ہے (۲۰/۲۳)۔ یقیناً وہ سب کچھ دیکھنے' سننے والا ہے۔ اس لئے اس کا ہر فیصلہ علم وحکمت پر مبنی ہوتا ہے۔" (۱۷/۱)

۲۷ صفر ۱۳ نبوی (مطابق ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء) رات کی تاریکی میں حضورؐ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ سمیت مکہ چھوڑ دیا۔

منزل تین سو (۳۰۰) میل دور ہے اور راستہ اتنا خصومتی (HOSTILE) کہ اپنے سانس کی آواز سے بھی انسان چونک پڑتا ہے۔ سنگلاخ آگ اگلتے سیاہ پہاڑ، پانی ناپید لیکن جس کے دَم سے دنیا کو سنوارنے اور بہارِ نو کا پیغام دینے کا فریضہ ہو، اس کے راستے کے کانٹے بھی پھول بن جاتے ہیں ـــــ بریدہ اسلمیؓ لالچ میں حضورؐ کی تلاش میں نکلا تھا مگر سامنا ہوتے ہی اپنے ستر (۷۰) آدمیوں سمیت حلقہ بگوش ہو گیا۔ ۸۔ ربیع الاوّل، ۲۳ ستمبر ۶۲۱ء کو یہ قافلۂ جذب و سرور نور و نکہت کی ہزاروں دنیائیں اپنے جلو میں لئے یثرب کے قریب ایک بستی قبا میں پہنچا۔ یہاں انصار کے کچھ خاندان آباد تھے۔ حضورؐ نے ان کی میزبانی قبول فرمالی۔

خدا کے گھر (مسجد الاحرام) کے بعد دنیا میں پہلی مسجد یہاں تعمیر ہوئی کہ نظامِ خداوندی کا مرکز مسجد ہی ہوتی ہے یہاں سے آپؐ شہر کی طرف روانہ ہوئے تو راہ میں بنی سالم کے محلہ میں جمعہ کا خطبہ فرمایا اور پھر یہ کاروانِ نور و نکہت یثرب میں داخل ہوا۔ یہاں پر سب سے پہلے کچی اینٹوں اور کھجور کے پتوں سے مسجد کی تعمیر کی گئی جس کے اندر تربیت پانے والوں کے قلب و دماغ اس قدر پختہ کہ دنیا کی آہنی قوتیں ان سے ٹکرائیں اور پاش پاش ہو گئیں۔ حضورؐ نبی کریمؐ کی یثرب میں آمد سے اس کو نیا نام مدینۃ النبی ملا۔

حضور نبی کریمؐ کو مدینہ منورہ میں نظامِ خداوندی قائم کرنے کے لئے اپنی دس سالہ زندگی کے دوران کم و بیش ۸۲ غزوات اور جنگوں سے واسطہ پڑا۔ آخر الامر پورے جزیرۃ العرب میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی جو حضرت عمرؓ فاروق اعظم کے عہدِ خلافت میں بڑھ کر بائیس (۲۲) لاکھ مربع میل کو محیط ہو گئی ـــــ اس کچی اینٹوں اور کھجور کے پتوں سے تعمیر ہونے والی مسجد سے تربیت یافتہ نے دنیا کو آئینِ جہاں داری کا سبق دیا۔ سنگِ مرمر اور سونے سے مزین، اب اس مسجد نبوی سے نکلنے والے غیر مسلموں سے ہر قسم کا سبق لے رہے ہیں۔ اب یہ مسجد، مسجد نبویؐ سے بڑھ کر "حرم" کہلاتی ہے۔ اس جہت سے مسجد الاحرام اور مسجد نبویؐ دونوں کو حرمین شریفین کہا جا رہا ہے۔

خلفائے راشدینؓ کے تابناک عہد کے تسلسل ہی میں سرکش قوت نے خلافت کے لبادے میں سر ابھار لیا۔ مسجد الاحرام (مرکزِ ملت، قبلہ) کو آسمانوں کی بھول بھلیوں میں گم کے ثانوی حیثیت دینا، اس سرکش قوت کا سب سے پہلا، نمایاں اور مؤثر کارنامہ تھا۔ اور پھر روایات کی ایسی بھرمار کر دی کہ اچھے بھلے باشعور افرادِ ملت "عقیدت" کے سامنے عاجز ہو کر رہ گئے۔ جس نے بھی "توحیدِ خالص" کو روایات کی بیساکھیوں، آسمانوں کی بھول بھلیوں اور عقیدت مندوں سے آزاد کرنے کی کوشش کی، قتل کر دیا گیا۔ ایسی

صورت میں ایک "حرم" کو "دو حرم" کرنے والوں کو کون روک سکتا ہے ـــــ توحید کی حقیقت روایات کی سچائیوں میں گم کر دی گئی اور توحید! توحید نہ رہی ـــــ

خضر کیونکر بتائے، کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

ماخذ

جوئے نور	معراجِ انسانیت	مفہوم القرآن	تکملہ
علامہ پرویزؒ	علامہ پرویزؒ	علامہ پرویزؒ	علامہ المشرقیؒ

حدیث النبیؐ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خبردار فتنہ واقع ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! اس سے کس طرح نجات ہوگی۔ آپؐ نے فرمایا کہ کتاب اللہ (پر عمل کرنے) سے۔ جس میں تمہارے درمیان (حرام وحلال یا طاعت وگناہ) کا حکم ہے اور حق وباطل کے اندر قولِ فیصل ہے۔ جس متکبر نے قرآن کو چھوڑا ہلاک کرے گا اس کو اللہ اور جس نے قرآن کے سوا کسی دوسری چیز میں ہدایت طلب کی گمراہ کرے گا اس کو اللہ۔ جس نے لوگوں کو قرآن کی طرف بلایا، اس کو سیدھی راہ دکھائی گئی۔ (مشکوٰۃ۔ بحوالہ ترمذی۔ دارمی)

کیا ہم آزاد ہیں ؟

اگست ۱۹۴۰ء میں جب ہم نے اپنی آزادی کی پہلی سالگرہ منائی تو اس موضوع پر جو کچھ طلوعِ اسلام میں لکھا گیا تھا وہ آج بھی ہر سوچنے والے ذہن کو اسی طرح دعوتِ غور و فکر دیتا نظر آتا ہے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ

انسانی تاریخ کے اوراق پیچھے کو الٹتے جائیے۔ کاغذ سے دھاتوں اور دھاتوں سے پتھروں محلات سے جھونپڑیوں اور جھونپڑیوں سے غاروں تک کے ازمنہ مظلمہ میں پہنچ جائیے۔ اس کی تہذیب کے نقشے بدلتے اور اس کے تمدن کے خاکے مختلف ہوتے چلے جائیں گے۔ زبانیں بدلیں گی، خیالات بدلیں گے، طرزِ بود و ماند بدلے گا، اسلوبِ رفتار و گفتار بدلیگا۔ لیکن اعصار و دہور کے اس تضاد و تباین اور اعصار و دیار کے اس اختلاف و تنوع میں ایک شے ہر جگہ اور ہر مقام پر مشترک اور غیر متبدل نظر آئے گی اور وہ یہ کہ انسانی شعور نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس نے ہمیشہ آزادی کی حمد و ستائش میں لاہوتی نغمے گائے ہیں۔ اس نے مختلف زمانوں میں مختلف خداؤں کو چھوڑا اور مختلف دیوتاؤں کو پوجا ہے۔ لیکن اس نے آکاش کی اس دیوی کے حضور بلا تخصیص زمان و مکان ہمیشہ شردھا کے پھول چڑھائے اور عقیدت کی شمعیں جلائی ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں آپ کو خدا تک کے منکرین مل جائیں گے لیکن کسی دور میں ایسا گروہ نہیں ملے گا جس نے آزادی کی عظمت سے انکار کیا ہو۔ انسانی تاریخ کیا ہے؟ اپنی اپنی آزادی کے تحفظ کی جدوجہد کی مسلسل داستان۔ مختلف ادوار میں نمارید و فراعنۂ زمان اور اکاسرہ و قیاصرۂ دہر ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ کمزور و ناتواں انسانوں کے سینے سے آزادی کی تمنا کو مٹا دیا جائے لیکن کمزور و ناتواں انسانوں نے اپنا سب کچھ لٹنا اور مٹنا گوارا کر لیا مگر آزادی کی حسین آرزوؤں کو اپنے دل کے کاشانوں سے کبھی مٹنے نہیں دیا۔ انہوں

نے اس قربان گاہ پر اپنی عزیز ترین متاعِ حیات تک بھینٹ چڑھادی لیکن اس کی آن پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ تاریخ کے ریگِ ساحل پر ان گنت موجیں آئیں اور مختلف نقوش کو بہا کر اپنے ساتھ لے گئیں۔ لیکن اگر کوئی نقش ایسا تھا جو اس کی مسلسل تگ و تاز کے باوجود کبھی مٹ نہ سکا تو وہ اس بطلِ جلیل کا نقش تھا جس نے آزادی کے تحفظ کی خاطر جان دے دی۔ یا پھر اس ننگِ انسانیت کا نام جس نے اپنوں کی آزادی کو دوسروں کے ہاتھوں بیچ دیا۔ بہرحال، دنیا نے ہر قوم کی عظمت کو آزادی کے پیمانوں سے ماپا اور اسی کے معیاروں سے جانچا ہے۔ بایں نمط کہ آزادی کا لفظ دنیا کے ہر لغت میں شرف و مجدِ انسانیت کے مرادف اور غلامی، ذلت و خواری کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود کیا یہ امر باعثِ صد تعجب و موجبِ ہزار حیرت نہیں کہ آزادی کی خاطر سب کچھ کر گزرنے والا انسان آج تک یہ بھی متعین نہیں کر سکا کہ آزادی کہتے کسے ہیں؟ عوام کو تو چھوڑیئے اس باب میں خواص کی یہ کیفیت ہے کہ وہ آزادی کی کوئی متعین (DEFINITION) بھی نہیں دے سکے۔ ہندوستان میں تحریک آزادی سے بھی یہی مفہوم لیا گیا تھا۔ وہ تحریک سامراج (یعنی غیروں کی حکومت) کے مقابلہ میں سوراجیہ (اپنی حکومت) کے لئے جدوجہد تھی۔

ضمناً (مہاتما) گاندھی نے مسلمانوں میں رائج اصطلاح ۔ حکومتِ خداوندی ۔ کے مقابلہ میں رام راجیہ کی اصطلاح وضع کی تھی لیکن وہ چل نہیں سکی تھی۔ وہاں آزادی کے لئے سوراج ہی کی اصطلاح رائج رہی۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ ایک غیر قوم، یعنی انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر، ان کی جگہ اپنی حکومت قائم کی جائے۔ یہی تحریکِ آزادی کا منتہیٰ و مقصود تھا۔

ہندوستان کی تحریکِ آزادی

اس جدوجہد میں، ہندوستان کے علاوہ، مسلمانوں کے بڑے بڑے سیاسی لیڈر اور مذہبی راہ نما، مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ شامل تھے اور اس جدوجہد کو جہاد قرار دیتے تھے۔ یہ جدوجہد ایسی تھی جس کے مقصد و منتہیٰ (یعنی غیروں کی جگہ اپنی قوم کی حکومت کے قیام) کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس میں دو آرا ہو نہیں سکتیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب یہ جدوجہد پورے زوروں پر تھی تو اس کے خلاف ایک آواز بلند ہوئی جس نے نہایت واضح الفاظ میں کہا کہ آزادی کا یہ مفہوم ہندو کے نزدیک صحیح ہو سکتا ہے لیکن مسلمانوں کے نزدیک آزادی کا یہ مفہوم و مقصود درست قرار نہیں پا سکتا۔ ان کے نزدیک، آرزوئے اسلام آزادی کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ تحریک آزادی کے علمبرداروں نے اس آواز کی سخت مخالفت کی اور اس میں چونکہ یہ کہا گیا تھا کہ اسلام کی رُو سے آزادی کا مفہوم اس سے مختلف ہے اس لئے اس آواز کی مخالفت میں علماء حضرات بڑی شد

مدسے آگے بڑھے۔ انہوں نے مشہور یہ کیا کہ یہ آواز انگریز کے وضع کردہ ناقوس کی صدائے بازگشت ہے اور مقصد اس سے آزادی کی تحریک کے راستے میں روڑے اٹکانا ہے۔ اس آواز کے بلند کرنے والے نے کہا کہ یہ الزام سراسر کذب ہے' افترا ہے۔ جہاں تک انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کا تعلق ہے' مسلمان ہندوؤں سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ لیکن جہاں انگریزوں کا یہاں سے نکل جانا' ہندوؤں کے نزدیک مقصود و منتہیٰ ہے' مسلمانوں کے نزدیک یہ اس جدوجہد کا منتہیٰ نہیں قرار پا سکتا۔ یہ ان کے پیشِ نظر مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ یا سنگِ میل قرار پا سکتا ہے۔ یہ آواز تھی حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی جنہوں نے مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے اعتراض کے جواب میں اپنے مفہوم کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی کہ:-

علامہ اقبالؒ کی آواز

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مدد نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے، ایسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ میں ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا' بولنا' روپیہ صرف کرنا' لاٹھیاں کھانا' جیل جانا' گولی کا نشانہ بننا' سب حرام سمجھتا ہوں۔ قطعاً حرام۔

اس کے جواب میں کہا گیا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد' ہندوستان میں جمہوری نظام نافذ کیا جائے گا۔ جسے نہ صرف یہ کہ اس وقت دنیا کا بہترین نظامِ سیاست تسلیم کیا گیا ہے' بلکہ وہ عین اسلام ہے۔ اس لئے اقبالؒ کا اعتراض' اس کی قدامت پرستی' تنگ نظری اور تعصب پر مبنی ہے۔ اقبال نے کہا کہ جس نظام کو تم بہترین نظام کہتے ہو' آزادی کے عام تصور کی رو سے بھی اس حقیقت یہ ہے کہ

جمہوریت

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اور جہاں تک اس کے اسلامی ہونے کا تعلق ہے' سن رکھو کہ

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اسلامی نقطۂ نگاہ سے مغرب کا جمہوری نظام ویسا ہی مردود و مطرود ہے جیسا نظامِ ملوکیت۔ اس نظام کے تحت ہندوؤں کو ہم آزادی کہہ ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا، ہندو کی تحریکِ آزادی کے خلاف، مسلمان اسی طرح نبرد آزما رہیں گے جس طرح انگریز کی غلامی کے خلاف محاذ آرا رہے۔ اس کے بعد جب تحریکِ آزادی کی زمامِ قیادت قائدِ اعظمؒ نے اپنے ہاتھ میں لی تو وہ بھی مسلسل اور متواتر اقبالؒ کی پیش کردہ حقیقت کو دہراتے رہے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ:

> ہم ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہمارا مذہب ایک دوسرے سے مختلف ہے بلکہ ہمارا کچھ بھی الگ ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ ہم اسی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں..... مسلمان اس لئے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مملکت میں وہ اپنے ضابطۂ زندگی، اپنے ثقافتی نشوونما اور روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔
>
> (تقاریر محمد علی جناح، جلد دوم، صفحہ ۳۴۳-۳۴۶)

یہ تھا آزادی کے مفہوم کے متعلق ہمارا اختلاف جس کی بنا پر ہم نے انگریز اور ہندو دونوں کے خلاف محاذ قائم کیا تھا۔ ہماری یہ محاذ آرائی اس وقت تک جاری رہی جب تک ہم نے پاکستان حاصل نہ کر لیا۔

ہم نے آزادی کے اپنے منفرد مفہوم کے لئے پاکستان حاصل کر لیا لیکن اس کے بعد دنیا نے ایک عجیب تماشہ دیکھا کہ یہاں پہنچ کر ہم نے مغرب کے اس جمہوری نظام کو رائج کر لیا جسے اقبالؒ نے اسلام کے خلاف سازش قرار دیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے دو بائیں کہی تھیں۔ ایک یہ کہ مغرب کا جمہوری نظام، استبدادِ ملوکیت کی ہی ایک نقاب پوش شکل ہے۔ اس میں نوعِ انسانی کبھی آزادی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ اور دوسرے یہ کہ یہ نظام اسلام کی ضد ہے اس لئے اس میں مسلمان کو وہ آزادی میسر نہیں آ سکتی جو اسے اسلام عطا کرنا چاہتا ہے۔

جمہوری نظام کے اساسی اصول مغرب کے جمہوری نظام (ڈیماکریسی) کے بنیادی اصول حسبِ ذیل ہیں:

(۱) اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں اور ان کے اس اقتدار پر کسی اور کا کنٹرول نہیں عوام کو اقتدارِ مطلق حاصل ہے۔ (DEMO - CRACY) کے معنی ہی عوام کی حکومت ہیں۔

(۲) اس نظام میں عوام اپنے حاکم آپ ہوتے ہیں اس لئے حاکم اور محکوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس میں یہ تفریق ہی مٹ جاتی ہے۔

(۳) عوام اپنے اس اقتدار کو اپنے نمائندگان کے ذریعے بروئے کار لاتے ہیں۔

(۴) ان نمائندگان کی اکثریت کے فیصلے یعنی وہ آئین یا قوانین جنہیں وہ وضع کریں حرفِ آخر ہوتے ہیں۔ جن کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ نمائندے اپنے فیصلوں کو جب چاہیں خود بدل سکتے ہیں۔

(۵) عوام کے یہ نمائندے دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ جو گروہ اکثریت میں ہوتا ہے وہ سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے۔ جو اقلیت میں رہ جاتا ہے اس کا مسلک اکثریت کی مخالفت کرنا اور ایسے حالات پیدا کرنا ہوتا ہے جن کی رُو سے وہ اقلیت میں تبدیل ہو جائیں اور اس طرح اقتدار ان سے چھن کر ان کے ہاتھ میں آجائے۔

(۶) برسرِ اقتدار (اکثریتی) پارٹی جو کچھ جی میں آئے کرے۔ اسے اس مدت سے پہلے جس کے لئے عوام نے انہیں اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا، خود عوام بھی برطرف نہیں کر سکتے بجز اس کے کہ وہ اکثریت میں نہ رہیں۔

مغرب کے اربابِ فکر و نظر اس نظام کے عملی تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نظام ایسے مفروضوں پر مبنی ہے جن کا یا تو کوئی وجود ہی نہیں اور یا جو یکسر باطل ہیں۔ قبل اس کے ہم ان اربابِ علم و دانش کے نتائجِ فکر کو سامنے لائیں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مغرب نے اس نظام کو وضع اور اختیار کن حالات میں کیا تھا۔

یورپ کا انقلاب

اقوامِ یورپ استبداد کی چکی کے دو پاٹوں میں بری طرح پس رہی تھیں۔ یعنی ملوکیت کی قہرمانی اور اربابِ کلیسا کی تھیاکریسی۔ تھیاکریسی کا نظریہ سینٹ پال کا وضع کردہ ہے جس نے کہا تھا کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے لیکن اس نے اپنا یہ حق کلیسا (پادریوں) کو تفویض کر دیا ہے۔ اب یہ خدا کے نام پر جو جی میں آئے کریں۔ جب کلیسا اور روزن شہنشاہیت میں گٹھ جوڑ ہوا تو یہی اختیاراتِ خداوندی شہنشاہوں کی طرف منتقل ہو گئے۔ لیکن ان پر کنٹرول کلیسا ہی کا رہا۔ لوتھر نے اپنی اصلاحی تحریک سے کلیسا کے فولادی شکنجے کو یہ کہہ کر توڑ ڈالا کہ انجیل کے سمجھنے کا حق ہر فرد کو حاصل ہے نہ کہ صرف چرچ کو۔ لیکن اس سے نظامِ حکومت کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ کیونکہ انجیل میں حکومت اور سیاست کے متعلق کوئی قانون ہی نہیں دیا گیا۔ لہٰذا حکومت کا استبداد بدستور قائم رہا۔ اس صورتِ حالات سے تنگ آکر فرانس میں ایک انقلاب برپا ہوا جس کا نتیجہ روسو کا نظریۂ حکومت تھا۔ اس نظریہ کی رو سے کہا یہ گیا کہ حقِ اقتدار نہ بادشاہوں کو حاصل ہے نہ کلیسا کے خدائی نمائندوں کو۔ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ یوں نظامِ جمہوریت کا ابتدائی تصور سامنے آیا۔ اگرچہ اس کا اساسی تصور مفکرینِ یونان نے بہت پہلے پیش کیا تھا۔ ملوکیت اور کلیسا کے استبداد کی چکی میں پسنے والی انسانیت نے اس نظریہ کو نجات دہندہ سمجھ کر نہایت جوش و خروش اور مسرت و انبساط سے اس کا خیر مقدم کیا اور اسے نوعِ انسان کے لئے آیۂ رحمت سمجھا۔ ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ نظریۂ جمہوریت (ڈیماکریسی) کے سامنے آنے پر یہ جوش و

۔۔۔ درحقیقت استبدادِ ملوکیت اور قہرمانی مذہبی پیشوائیت سے حصولِ نجات پر منفیانہ ردِّ عمل تھا۔ نظامِ جمہوریت کی کامیابی پر مثبت اظہارِ تشکر نہیں تھا۔ اس نظام پر تو ابھی تجربہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے عملی تجربہ کے بعد مفکرین مغرب جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، اس ضمن میں، میں اپنی کتاب "انسان نے کیا سوچا" کے ایک باب میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔

اس کا دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ اس میں حکومت، عوام کی رضامندی سے قائم ہوتی ہے اور جو حکومت کسی کی رضامندی سے قائم ہو۔ اس کی فرماں پذیری اس پر لازم آجاتی ہے۔ لہٰذا جمہوری نظام میں برسرِ اقتدار کی حکمرانی استبداد نہیں ہوتا، عوام کی بطیبِ خاطر رضامندی پر مبنی نظامِ اطاعت ہوتا ہے۔ پروفیسر (GEWIRTH) اس باب میں لکھتا ہے کہ (یہ مفروضہ بھی محض افسانہ ہے) "اس نظام میں لوگ حکومت کی اطاعت پر مجبور ہوتے ہیں جو اکثریت کی قائم کردہ ہوتی ہے۔ جس اقلیت نے ان نمائندوں کے خلاف ووٹ دیئے تھے یا جنہوں نے سرے سے ووٹ ہی نہیں دیئے تھے، ان کی اطاعت کو بہ طیبِ خاطر اطاعت کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟" (حوالہ ۲)

جمہوری نظام میں، روسو کے مفروضہ کے مطابق، حقِ اقتدار عوام کی مرضی کو حاصل ہوتا ہے اور یہ اقتدار بلا حدود و قیود ہوتا ہے۔ فرانسیسی مفکر (BERTRAND DE JOUVENEL) نے (SOVEREIGNTY) کے نام سے ایک بڑی عمدہ کتاب لکھی ہے۔ وہ اس باب میں اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ:

> بہ ادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر ایک دفعہ آپ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ انسانی مرضی اور ارادے (HUMAN WILL) کو اقتدارِ مطلق حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد جو نظامِ حکومت بھی قائم ہوں گے حقیقت کے اعتبار سے وہ سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظامِ ملوکیت اور جمہوری نظام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی رُو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو، یہ اصول اسے یکساں حقِ مطلق العنانی عطا کر دیتا ہے۔ (ص ۱۹۹)

اس مفکر کی اس تحقیق کے بعد اقبالؒ کا وہ شعر پھر سامنے لایئے جو اس نے اس سے بہت پہلے کہا تھا اور جسے میں شروع میں پیشِ خدمت کر چکا ہوں کہ

> ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

آپ نے دیکھا کہ جس شخص کی بصیرت شمعِ قرآنی سے کسبِ ضیا کرتی ہو وہ کس قدر جلد حقائق کو بے نقاب دیکھ لیتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ـــ کہ خار سے دید احوالِ چمن گفت ـــ اور اسی بنا پر وہ حتم و یقین کے ساتھ (لیکن بلا دعوےٰ) ایسا کہہ سکتا ہے کہ:

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

برٹرینڈ نے کہا تھا کہ انسانی ارادے کو مطلق اقتدار کا حق سونپنے کا نتیجہ استبداد اور مطلق العنانی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا خواہ نظام کوئی سا بھی کیوں نہ ہو۔ اس سے مغربی مفکرین کے سامنے یہ اہم سوال آیا کہ اگر انسانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا تو پھر حقِ مطلق کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ وہ لوگ اپنی مدت العمر کے فکری تجسس کے بعد اس باب میں جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ انتہائی غور و تعمق کا متقاضی ہے۔ ان اربابِ فکر کا کہنا ہے کہ نظامِ حکومت مقصود بالذات نہیں۔

عدل سے مراد یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ بلند مقصد ہے قیامِ عدل۔ اس کے بعد عدل کے متعلق ان کی تصریحات اور تقاضے ملاحظہ فرمائیے۔ مشیگن یونیورسٹی کا فلسفہ کا پروفیسر (WILLIAM . K . FRANKENA) لکھتا ہے کہ:

> عدل، قوانینِ مملکت کے مطابق فیصلوں کو کہا جاتا ہے۔ قانون کی اصطلاح میں تو ایسا کہنا درست ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود مملکت کے قوانین ہی عدل پر مبنی نہ ہوں، تو ان کے مطابق عملی اقدامات کو آپ سوشل جسٹس کس طرح کہہ سکیں گے۔ (حوالہ ۵)

اس سے یہ اہم سوال پیدا ہوا کہ اگر مملکت کے قوانین بہرحال مبنی برحق و صداقت قرار نہیں پا سکتے تو پھر حق و باطل اور (JUST AND UNJUST) کا معیار کیا ہوگا۔ اس سوال کے جواب میں یہ پروفیسر (LEWIS) کے الفاظ میں لکھتا ہے کہ:

> حق اسے کہیں گے جو تمام حالات میں حق ہو اور ہر فرد کے لئے یکساں طور پر حق ہو۔ عالمگیریت حق کی بنیادی شرط ہے۔ (حوالہ ۶)

نہ صرف عالمگیریت بلکہ ابدیت بھی — یعنی اسے ہر زمانے میں حق ہونا چاہیئے۔

آکسفورڈ اور کیمبرج کے ایک ممتاز صاحبِ علم (ERNEST BARKER) نے سیاستِ مُدن سے متعلق

ابدی اور غیر متبدل قانون ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے۔ (PRINCIPLES OF SOCIAL AND POLITICAL THEORY)

وہ اس میں لکھتا ہے کہ:

> اس مقام پر ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ کیا مملکت کے آئینی قانون کے شانہ بشانہ کوئی ایسا قانون بھی موجود ہے جو حقیقی اقدار پر مبنی ہے ..... وہ قانون جسے ہم "فطری" کہہ سکیں کیونکہ وہ اشیائے کائنات کی فطرت یا خود انسانی فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔

وہ قانون جو اس الحق پر مبنی ہوتا ہے۔ جو اپنی ذات میں حق ہوتا ہے جو اس عدل پر مبنی ہوتا ہے جو ہر جگہ اور ہر زمانے میں عدل ہوتا ہے۔ جو ان اقدار پر مبنی ہوتا ہے جو اپنی قیمت آپ ہوتی ہیں خواہ انہیں آئینی حیثیت حاصل ہوں یا نہ۔ یہ سوال آج کا پیدا شدہ نہیں یہ (SOPHOCLES) اور ارسطو کے زمانے میں بھی موجود تھا۔ ارسطو نے اس قانون میں جسے کوئی قوم وضع کر کے اپنے لئے اختیار کرلے اور اس میں جو تمام نوعِ انسان کے لئے عالمگیر ہو، تفریق کرتے ہوئے کہا تھا کہ مؤخر الذکر قانون 'قانونِ فطرت' ہے..... وہ قانون جو اس وقت بھی موجود ہوتا ہے جب نہ کسی قوم کا وجود ہو اور نہ کسی ایسے معاہدہ کا وجود جو مختلف افراد کو ایک رشتے میں منسلک کردے۔ اس کی تائید میں ارسطو نے سوفوکلس کا یہ شعر درج کیا ہے کہ

اس قانون کی قوت 'امروز و فردا' کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ ایک دائمی چشمہ سے پھوٹتا ہے جس کے منبع کا کسی انسان کو علم نہیں۔ (ص ۹۸)

اس کے بعد وہ (CICERO) کے یہ ناقابلِ فراموش الفاظ درج کرتا ہے کہ

سچا قانون وہ ہے جو فطرت کے عطا کردہ معیار کے مطابق حق اور باطل میں امتیاز کردے۔ اس کے علاوہ کوئی قانون بھی ہو اسے نہ صرف یہ کہ قانون سمجھنا نہیں چاہیئے۔ اسے قانون کہنا ہی نہیں چاہیئے۔ (ص ۱۲)

نہ صرف یہ کہ ایسے قانون کو قانون سمجھنا اور کہنا نہیں چاہیئے۔ (BARKER) کہتا ہے کہ ایسے قانون کی اطاعت ہی نہیں کرنی چاہیئے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

مملکت کے ساتھ میری وفاشعاری (LOYALTY) ان کے اقدار کے تابع ہے جن کے (تحفظ کے) لئے مملکت کا وجود عمل میں آیا ہے۔ اگر یہ مملکت ان اقدار کی وفاشعار نہیں رہتی تو ان اقدار کے تقاضے کی رو سے میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ اپنی وفاداری کو عدم وفاداری میں بدل دوں اور اس طرح ایک خوشگوار فرماں پذیری کے بجائے بادل نخواستہ مزاحمت کی روش اختیار کرلوں۔ (ص ۱۶۵) حقیقت یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ مملکت ایسے معاہدہ کا بنیادی حق رکھتی ہے جس کی رُو سے ہم پر اس کی اطاعت بہرحال واجب ہو۔ اس کے بجائے امر واقعہ یہ ہے کہ مملکت عدل کی مظہر اور اسے عمل میں لانے کا ذریعہ ہے ہم پر مملکت کے اربابِ اختیارات کے احکامات کی پابندی اس لئے لازم ہوتی ہے کہ مملکت عدل

قائم کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر مملکت ایسی نہیں رہتی تو اس کے ساتھ ہماری وفاشعاری اور اطاعت ختم ہو جاتی ہے۔ (صؔ ۱۹۳)

آگے چل کر وہ کہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اطاعت کا وجوب مشروط ہوتا ہے مطلق نہیں ہوتا۔ یہ اطاعت ہر حالت میں واجب نہیں ہوتی۔ یہ اس وقت تک واجب ہوتی ہے جب تک یہ حق کے کسی بلند تقاضا کے ساتھ ٹکرائے نہیں۔ (صؔ ۲۲)

آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! کہ نظامِ جمہوریت کے تلخ نتائج کا ستایا ہوا انسان اب کس قسم کے قانون کی تلاش میں ہے۔ ایک ازلی و ابدی، عالمگیر قانون جس کا سرچشمہ انسانی فکر سے بلند اور ماوراء ہو۔

اس کے بعد مغرب کا یہ مفکر بصد حرمان ویاس، ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا ہے کہ جمہوری نظام کے ہاتھوں تنگ آتے ہوئے متلاشیانِ حقیقت کی مشکل یہ تھی کہ اس قسم کے قوانینِ فطرت کا ضابطہ کہیں موجود نہ تھا۔

(BARKER. P. 100)

انسانوں کے خود ساختہ قوانین وضوابط کا ستایا ہوا انسان آج بھی اپنے آپ کو اسی مقام پر پاتا ہے جہاں اس

مفکرینِ مغرب کی دشواری

زمانے کا انسان تھا جس نے ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے استبداد سے نجات کی راہ نظامِ جمہوریت میں سمجھی۔ اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ جسے چشمہ حیات سمجھ کر اس کی طرف لپکا تھا وہ سراب ثابت ہوا۔ اور چشمہ حیات کا اب بھی اسے کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ اگرچہ اس کی تلاش میں وہ اس قدر سرگرداں وحیراں اور مضطرب وبیتاب ہے۔ ان کی فکر نے انہیں اتنا تو بتا دیا ہے کہ وہ ضابطہ قوانین جس میں انسانیت کی نجات کا راز مضمر ہے، کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ وہ ازلی، ابدی، زمان ومکان سے ماوراء، عالمگیر ہونا چاہیئے۔ وہ اس نتیجہ پر بھی پہنچ چکے ہیں کہ ایسا قانون انسانوں کا خود ساختہ نہیں ہو سکتا۔ انسانی فکر ایسا ضابطہ قوانین وضع ہی نہیں کر سکتی۔ اس کا سرچشمہ انسانی فکر سے ماوراء ہونا چاہیئے۔ وہ یہاں تک تو پہنچ گئے ہیں۔ لیکن وہ اسے منزل من اللہ یا وحی کہہ کر نہیں پکارتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ہم نے اسے قانونِ خداوندی کہہ دیا تو پادری یہ کہتے ہوئے بھاگے بھاگے آجائیں گے کہ جس قانونِ خداوندی کے تم متلاشی ہو وہ قانون ہم دے سکتے ہیں کیونکہ ہم خدا کے نمائندے ہیں۔ اس سے ان پر تھیاکریسی کا وہی استبداد پھر مسلط ہو جائیگا جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے انہوں نے نظامِ جمہوریت وضع اور اختیار کیا تھا۔ فکرِ مغرب کی یہی بے کلی اور بیتابی اور دوسری طرف بے بسی اور بے چارگی تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؔ نے کہا تھا کہ

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا

اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

مسلمانوں کی حالت

مغربی اقوام کی بے لبسی کا تو یہ عالم ہے لیکن مسلمانوں کی حالت ان سے بھی عجیب تر ہے۔ صدیوں کی غلامی اور محکومی نے ان کی فکری صلاحیتوں ہی کو سلب کر دیا ہے۔ محکومیت اسلئے بدترین لعنت ہوتی ہے کہ اس میں اقبالؔ کے الفاظ میں ——— "جاں بھی گروِ غیر بدن بھی گروِ غیر" ہوتے ہیں۔ محکوم اگر کسی وقت اپنے بدن کو ——— (حاکم قوم کے قبضہ سے چھڑا لیتا ہے تو بھی اس کی جان اس کے قبضے میں بدستور رہتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے اس کی آنکھ سے، سنتا ہے اس کے کانوں سے، سوچتا ہے اس کے دماغ سے۔ وہ قوم غالب کے ہر نظریہ، مسلک یا نظام کو عرش سے نازل شدہ سمجھتا اور اس کی تقلید کو اپنے لئے موجبِ ہزار فخر و مباہات قرار دیتا ہے۔ اقوامِ غالب اپنی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کو اس کی طرف پھینکتی ہیں اور یہ انہیں لپک کر اٹھاتا اور اپنے لئے خوانِ یغما سمجھتا ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد جب ہمیں ایک نظام کی ضرورت پڑی تو ہم نے مغرب کے جمہوری نظام کو صحیفۂ آسمانی سمجھ کر تقدس کے ہاتھوں سے اٹھایا اور عقیدت کی آنکھوں کے ساتھ لگا کر اسے بکمالِ فخر و مباہات اپنے ہاں نافذ کر لیا۔ حالانکہ اس وقت یہ نظام مغرب کے ہاں ناکام تجربہ ثابت ہو رہا تھا اور، جیسا کہ میں نے ابھی ابھی بتایا ہے، وہاں کے مفکرین کسی دوسرے نظام کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ہمارے ہاں شروع میں تو اس نظام کی حیثیت سیاسی سی تھی لیکن جب یہاں اس جماعت نے جو اقامتِ دین کی مدعی ہے اپنے مصالح کے پیشِ نظر..... بحالی جمہوریت کی تحریک چلائی تو اس نظام کو عین اسلامی قرار دے دیا۔ حالانکہ یہ نظام یکسر اسلام کی ضد ہے۔

قرآنی نظام

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، جمہوری نظام کی اصل و اساس اس مفروضہ پر ہے کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ انہی کو حقِ حکومت پہنچتا ہے اور ان کے نمائندوں کی اکثریت کو آئین و قانون سازی کا حقِ مطلق حاصل ہوتا ہے۔ قرآن سرے سے اس مفروضہ کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنائے۔ خواہ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کا کوئی گروہ (۳/۷۸)۔ قرآنِ کریم کے اس اوّلیں اصول کی رُو سے ایک طرف مغربی نظامِ جمہوریت خلافِ اسلام قرار پا جاتا ہے اور دوسری طرف اس سے آزادی اور غلامی کا صحیح تصور سامنے آ جاتا ہے۔ اس کی رُو سے انسانوں کی حکومت، خواہ وہ اپنی قوم کی ہو اور خواہ کسی دوسری قوم کی، بہرحال غلامی ہے۔

اس کے بعد، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں، تو پھر یہ حق کسے حاصل ہے۔ اس لئے کہ قرآن کا یہ منشا، تو ہو نہیں سکتا کہ انسانوں میں نظامِ حکومت سرے سے ہو ہی نہ۔ وہ انسانوں کی

حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے

تمدنی زندگی کے لئے نظامِ حکومت ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶) بنا بریں۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کی جائے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲/۴۰) یہی حکم نظامِ حیات ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو سمجھتے نہیں اور وہ انسانی حکومتوں کی ہیئت (FORM) بدل کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی حاصل کر لی ہے۔ ہیئت کے بدل دینے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔

لیکن اس سے وہ خدشہ سامنے آجاتا ہے جس سے مجروح ہو کر اہلِ مغرب نے نظامِ جمہوریت اختیار کیا تھا۔ وہاں مذہبی پیشوائیت نے یہی کہا تھا کہ حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں، خدا کو حاصل ہے لیکن خدا اپنی حکومت اپنے نمائندگان کے ذریعے قائم کرتا ہے جنہیں وہ اپنے اختیارات تفویض کر دیتا ہے۔ ہم اس کے نمائندے ہیں، اس لئے ہماری حکومت انسانوں کی حکومت نہیں، خدا کی حکومت ہے۔ اس سے تھیاکریسی کا وہ نظامِ حکومت وجود میں آگیا جو ملوکیت سے بھی بدتر تھا۔ ملوکیت کے خلاف تو بغاوت بھی کی جا سکتی تھی جس کی نوعیت بہرحال سیاسی سمجھی جاتی تھی۔ خدا کے ان (مزعوم) نمائندوں کے خلاف بغاوت خود خدا کے خلاف بغاوت قرار پاجاتی تھی۔

اس کا عملی ذریعہ کتاب اللہ کی حاکمیت ہے

قرآن نے کہا کہ خدا کی حکومت، خدا کی کتاب (یعنی قرآن کریم) کے ذریعے ہو گی جس میں کسی انسان کا کوئی دخل نہیں ہو گا، کیونکہ خدا اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کیا کرتا۔ یہ اس کی کتاب کے اندر محفوظ ہیں۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے خود زبانِ نبویؐ سے کہلوایا گیا کہ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۵) "کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور حاکم کی طلب و جستجو کروں، حالانکہ اس نے اپنی کتاب نازل کر دی ہے جو مفصل ہے۔" یہاں سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔ ایک یہ کہ تھیاکریسی اس لئے وجود میں آئی تھی کہ خدا کی کوئی ایسی کتاب وجود نہیں تھی جو ضابطۂ زندگی بن سکتی (انجیل میں قوانین ہیں ہی نہیں) اس لئے جب خدائی حکومت کا اصول تسلیم کر لیا جاتا تھا تو اس کے لوگوں کو لازماً مذہبی پیشوائیت کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس حقیقت کا اعلان خود ذاتِ رسالتمآبؐ سے کرانے میں حکمت یہ تھی کہ دنیا میں اگر کوئی انسان خدا کا نمائندہ بن سکتا تھا تو اس کا اوّلین حق بہرحال رسول اللہ کو پہنچتا تھا۔ جب حضورؐ نے بھی یہ فرما دیا کہ خدا کی حکومت کے معنی اس کی کتاب کی حکومت ہے تو انسانی نمائندگی یا خدائی اختیارات کی تفویض کا نظریہ خود بخود باطل قرار دیا گیا۔ اس نظریہ کی رو سے حکومت خدا کی کتاب کے احکام و قوانین نافذ

کرنے کی ایجنسی قرار پائی۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ اس نظریہ کی صداقت کا تسلیم کر لینا ایمان قرار پایا اور اس سے انکار، کفر۔ سورۃ مائدہ میں ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۵/۴۴)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی کافر ہیں۔

اور اس کے ساتھ ہی رسول اللہ سے فرمایا گیا کہ۔ وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۹) " ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو" گویا یہاں پھر اسے دہرا دیا کہ یہ حکومت تھیاکریسی نہیں ہوگی۔ یہ کتاب اللہ کی حکومت ہوگی۔ قرآنِ کریم نے خدا کے سوا ہر اتھارٹی کو طاغوت کہہ کر پکارا ہے اور کفر اور ایمان کے اس فرق کو ان الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا...... (۲/۲۵۶) " جو خدا پر ایمان لایا اور اس نے طاغوت سے انکار کیا تو اس نے ایسا محکم سررشتہ تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا" اور اس "کفر بالطاغوت" کی تشریح ان الفاظ سے کر دی کہ " کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو بزعمِ خویش سمجھتے ہیں کہ ہم کتاب اللہ اور کتبِ سابقہ پر ایمان لے آئے ہیں لیکن عملاً ان کی حالت یہ ہے کہ وہ چاہتے یہ ہیں کہ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ (۴/۶۰) " اپنے معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں حالانکہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ طاغوت سے انکار کریں"۔ یہاں سے بات بالکل واضح ہو گئی کہ خدا پر ایمان سے عملاً مفہوم یہ ہے کہ حکومت کے لئے اس کی کتاب کو اتھارٹی تسلیم کیا جائے۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور اتھارٹی تسلیم کر لی گئی تو یہ کفر ہوگا۔ اس کتاب کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اسے مفصل کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَ تَمَّتْ كَلِمٰتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ۗ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶) خدا کے کلمات (قوانینِ خداوندی) صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں۔ بالفاظِ دیگر یہ ضابطۂ خداوندی مفصّل، مکمل اور غیر متبدل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لئے محفوظ بھی (۱۵/۹)۔

لیجئے! جس قسم کے ضابطۂ حیات کی مفکرینِ مغرب کو تلاش تھی، لیکن وہ انہیں کہیں سے ملتا نہیں تھا، وہ سامنے آ گیا۔ وہ صحیفۂ آسمانی جس میں نہایت محکم قوانین ہیں۔ نوعِ انسانی کو حقیقی آزادی اس کتاب کی اطاعت سے مل سکتی ہے، اسی سے انسانوں کی حکومت کی وہ زنجیریں ٹوٹ سکتی تھیں۔ جن میں نوعِ انسان جکڑی چلی آ رہی تھی اور اسی سے وہ بوجھل سلیں ان کے سر سے اتر سکتی تھیں جن کے بوجھ تلے وہ اس بری طرح دبی ہوئی تھی (۷/۱۵۷)۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اسلام میں حکومت، قرآنی احکام و اقدار کے نفاذ کی ایجنسی ہے۔ بالفاظِ دیگر اسے

استخلاف فی الارض

قانون سازی کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس کا منصب قوانینِ خداوندی کا نفاذ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی حیثیت اجرائیہ یا انتظامیہ کی رہ جاتی ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اسے "استخلاف فی الارض" کہا جاتا ہے۔ یہیں سے لفظ خلیفہ ہے۔ (ضمناً) یہ جو ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا تو یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ قرآن میں کہیں نہیں آیا کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ یہ عیسائیت کا تصور ہے جس کی رُو سے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ خدا نے اپنے اختیارات اپنے نمائندوں (کلیسا) کو تفویض کر دیئے ہیں۔ اس نکتہ کی وضاحت پہلے بھی کی جا چکی ہے اسی تصور سے متاثر تھا وہ ذہن جس نے ایک دفعہ حضرت صدیق اکبرؓ کو خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا تو آپ نے اسے سختی سے روک دیا اور کہہ دیا کہ خدا کا خلیفہ کوئی نہیں ہو سکتا، میں خلیفۃ الرسول (یعنی رسول کا جانشین) ہوں۔ اور حضرت عمرؓ نے اتنے سے التباس کے امکان کو بھی ختم کرنے کے لئے خلیفہ کے بجائے امیر المومنین کا لقب اختیار فرمایا۔

اس مقام پر ذرا رکیئے اور دیکھئے کہ الفاظ جب تاریخ کی مختلف وادیوں سے گزرتے ہیں تو ان کے حقیقی معانی کس طرح ان راہوں کے گرد و غبار میں چھپ جاتے ہیں اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے، وہ کیا سے کیا بن جاتے ہیں۔ امیر کے بنیادی معنی راستے کی نشاندہی کرنے والے یا راہنما کے تھے اور آج جن معانی میں یہ لفظ ہمارے ہاں مستعمل ہے وہ کیا ہے؟ یہ وجہ ہے کہ جو میں اس پر زور دیا کرتا ہوں کہ قرآن کریم کو اس کے مفردات کے اور جن معانی کی رُو سے سمجھنا چاہیئے نہ کہ ان معانی کی رُو سے جن کا لبادہ ان الفاظ نے بعد میں اوڑھ لیا۔

بہر حال بات "استخلاف فی الارض" کی ہو رہی تھی جس سے مراد ہے وہ قوت جس کی رُو سے قرآنی احکام و اقدار کو نافذ کیا جائے۔ زمانہ قدیم میں، جب ہنوز قوت کا مرکز شخصیتیں ہوتی تھیں، اللہ تعالیٰ نے افراد کو خلیفہ کہہ کر پکارا ہے۔ سورۃ صٓ میں حضرت داؤدؑ کے متعلق ہے۔ یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (۳۸/۲۶) "اے داؤد! ہم نے تمہیں ملک میں خلیفہ بنایا ہے سو تم لوگوں میں الحق (وحیٔ خداوندی) کے مطابق حکومت قائم کرو۔" لیکن جب نوعِ انسان اپنے بچپن کی منزلیں طے کر لینے کے بعد عالمِ شباب تک آ پہنچی تو شخصیتوں کا دَور ختم ہو گیا اور عالمگیر انسانیت کے لئے وحی کی راہنمائی میں اپنے معاملات آپ طے کرنے کا نیا دور شروع ہو گیا۔ تاریخ میں حضور رسالتمآبؐ اس دورِ کہن کے اختتام اور عصرِ جدید کے آغاز کے نقطۂ اتصال پر فائز نظر آتے ہیں۔ ختمِ نبوت کا اعلان اسی انقلاب کی تمہید ہے۔ چنانچہ اس مقام پر پہنچ کر استخلاف فی الارض، اشخاص کی بجائے امتوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ کیا آپ نے اس پر کبھی غور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کے متعلق تو فرمایا کہ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ۔ لیکن حضور خاتم الانبیاء کے زمانے میں کہا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ (۲۴/۵۵)

تم میں سے جو لوگ وحی کی ابدی صداقتوں کو تسلیم کریں گے اور ان کے اعمال اس پیمانے پر پورے اُتریں گے تو انہیں استخلاف فی الارض عطا کیا جائے گا۔ یہ خدا کا وعدہ یعنی اس کا غیر متبدل قانون ہے۔ یعنی اب استخلاف فی الارض اشخاص کے بجائے امتوں کے حصے میں آئے گا۔ سوچئے عزیزانِ من! کہ اس انقلابِ عظیم کا اعلان آج سے چودہ سو سال پہلے اس زمانے میں ہوا جب ساری دنیا میں شخصی حکومتوں کا دور دورہ تھا اور افراد کی جگہ امتوں کی حکومتوں کا تصور تک کسی کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) حتیٰ کہ اس نظام کے سربراہِ اوّل، جو بہرحال رسول اللہ ہی ہو سکتے تھے، اسے بھی تاکید کر دی کہ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳/۱۵۸) "مملکت کے معاملات طے کرنے کے لئے افرادِ امت سے مشورہ کیا کرو"۔ ان احکامات کی رُو سے قرآن کریم نے ہر قسم کی شخصی حکومت۔ ملوکیت یا آمریت ۔۔۔ کا خاتمہ کر دیا۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ استخلاف فی الارض۔ یعنی نظامِ حکومت مقصود بالذات نہیں تھا، ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا اور وہ بلند مقصد تھا، قرآنی اصول و اقدار اور احکام و قوانین کا نفاذ و اجراء۔ سورۃ النور میں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ ایمان و اعمالِ صالحہ کے نتیجہ میں تمہیں استخلاف فی الارض حاصل ہوگا، اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ یہ استخلاف اس لئے دیا جائے گا۔ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ (۲۴/۵۵) تاکہ اس سے اس دین کا تمکن ہو جائے (وہ نظامِ زندگی قائم اور (ESTABLISH) ہو جائے) جسے تمہارے لئے پسند کیا گیا ہے۔ مملکت کے اس فریضہ کو دیگر مقامات میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ان امور کا نافذ کرنا جنہیں قرآن کی سندِ قبولیت حاصل ہو اور ان سے لوگوں کو روکنا جو اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں۔ سورۃ حج میں ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں تمکن حاصل ہوگا تو اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ان کا فریضہ ہوگا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ان کے تمکن کا مقصد۔ اس میں تمام معاملات انجام کار خدائی پروگرام کی تکمیل کے لئے سرانجام پائیں گے۔

متعدد مقامات پر اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس نظام میں (امت تو ایک طرف) خود رسول اللہ کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ خدا کی طرف سے عطا کردہ ضابطۂ حیات (قرآن کریم) میں کسی قسم کا ردّ و بدل کر سکیں۔ مخالفین کہتے کہ ہم اس نظام میں شریک ہونے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ تم اس ضابطہ میں کچھ تبدیلیاں کر دو۔ اس کے جواب میں حضورؐ فرماتے

کہ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۔ "یہ میرے اختیار ہی میں نہیں کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر دوں. اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ۔ میں تو خود بھی اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ٥ (۱۰/۱۵) "اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو اس کی سزا سے میں بھی نہیں بچ سکتا" نیز (۱۱/۱۱۳) ... ۴۸/۹).

یہاں سے ایک اور اہم نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے. ہم نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ میں خود اسی ضابطہ قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتا ہوں. اگر میں بھی اس کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے محفوظ نہیں رہ سکتا. اس سے واضح ہے کہ" اطاعت اس ضابطہ خداوندی (قرآن کریم) کی ہے. اسلامی نظام مملکت اس کی اطاعت کرانے کی مشینری وضع کرتا ہے. قرآن کریم میں جہاں" خدا اور رسول کی اطاعت" کا حکم ہے تو اس کا عملی مفہوم نظام کی اطاعت ہے جو اس ضابطہ خداوندی کو عملاً نافذ کرتا ہے. سورۃ النّور میں ہے۔
اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (۲۴/۵۱) "مومنوں کی روش یہ ہوتی ہے کہ جب انہیں خدا اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ رسول ان کے معاملات کا فیصلہ کرے تو وہ بطیب خاطر کہتے ہیں کہ ہم نے اس حکم کو سُن لیا ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے." اس سے دو تین باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہیں.

۱۔ معاملات کے تصفیہ کے لئے بلایا جاتا ہے" خدا اور رسول" کی طرف.
۲۔ ایسا اس لئے کیا جاتا ہے کہ رسول ان کے معاملات کا فیصلہ کرے.
۳۔ رسول سے کہا جاتا ہے. وَ اَنِ احْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۹) ان کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرو.
۴۔ مومنین ان فیصلوں کی اطاعت کرتے ہیں.

اس سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ اطاعت درحقیقت کتاب اللہ کی ہے. نظامِ مملکت اسلامیہ

اطاعت صرف کتاب اللہ کی ہے

اس کی اطاعت کرانے کا عملی ذریعہ ہے اس نظام میں اپنی اطاعت کوئی بھی نہیں کرا سکتا ۔ نہ کوئی ایک فرد، نہ افراد کا مجموعہ. سورۃ آلِ عمران میں اسی حقیقت کو واضح تر الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ٥ (۳/۷۸)

کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا۔ خواہ خدا اسے ضابطہ قوانین یا حکومت یا نبوت ہی کیوں نہ عطا کر دے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں، میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم اس کتاب کی اطاعت کے ذریعے جسے تم پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہو، اللہ کے محکوم (ربانی) بن جاؤ۔

رسول اللہ لوگوں سے جو بیعت (حلفِ وفاداری مملکت) لیتے تھے، وہ بھی درحقیقت اطاعتِ خداوندی ہی کے

حلفِ وفاداری

اقرار و اعلان کی بیعت ہوتی تھی۔ اسی لئے قرآن نے واضح طور پر کہہ دیا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ "جو لوگ اے رسول! تیری بیعت کرتے ہیں یہ درحقیقت خدا کی بیعت ہے۔" یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (۴۸/۱۰) "ان کے ہاتھ پر مجازی طور پر تو تیرا ہاتھ ہوتا ہے لیکن معنوی طور پر وہ خدا ہی کا ہاتھ ہوتا ہے" اور اس بیعت میں اس امر کی صراحت ہوتی تھی کہ وَ لَا یَعْصِیْنَکَ فِیْ مَعْرُوْفٍ (۶۰/۱۲) یہ اطاعت معروف میں ہوگی، منکر میں نہیں۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ کبھی منکر کا حکم نہیں دے سکتے تھے جو یہ کہلانے کی ضرورت پڑتی کہ ہم صرف معروف میں آپ کی اطاعت کریں گے اس کی وضاحت اس لئے کر دی گئی کہ اس نظام کو حضورؐ کے بعد بھی آگے چلنا تھا۔ ان آنے والوں کے لئے اس کی وضاحت کر دی کہ اس نظام کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک یہ معروف کا حکم دے (یعنی قرآنی اصول و اقدار کے مطابق) اگر اس کا کوئی حکم منکر کا ہو (یعنی کسی ایسی بات کا جسے قرآن ممنوع اور ناپسندیدہ قرار دیتا ہے) تو امت کی گردن سے اس کی اطاعت کا جُوا اتر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدینؓ اپنے اولین خطبہ خلافت میں اعلان کر دیا کرتے تھے کہ:

> تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جس سے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔　(خطبۂ خلافت حضرت ابوبکر صدیقؓ)

اور ان حضرات کے یہ اعلانات درحقیقت ان ارشاداتِ قرآنیہ ہی کی توضیح و تشریح تھے جن میں کہا گیا ہے کہ

کسی کی اطاعت نہیں کی جائیگی

احکامِ خداوندی کے خلاف کسی کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً اس نے کہا ہے کہ

وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۱۸/۲۸)

جو ہمارے قوانین کی طرف سے غافل ہو جائے اور اپنے جذبات ہی کے پیچھے لگ جائے

اور اس طرح اس کا معاملہ حد سے گزر جائے اس کی اطاعت مت کرو۔

اور سب سے آخر یہ کہ غلط بات پر اگر ساری دنیا کا اتفاق بھی ہو جائے تو بھی اسے اختیار نہ کرو۔ کیونکہ حق و باطل کا معیار کتاب خداوندی ہے نہ کہ اکثریت کے فیصلے۔ وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ (۶/۱۱۷)

لوگوں کی عام طور پر حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ ظن و قیاس کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اس لئے ان کی کوئی بات محض اس لئے صحیح قرار نہیں پا سکتی کہ اس کے حق میں اکثریت کی رائے ہے۔ کثرتِ رائے خواہ وہ اپنوں کی ہو یا دوسروں کی، محض اکثریت کی سند سے حق نہیں قرار پا سکتی (۷/۴۹)۔

آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! کہ اس سے کس طرح مغربی نظریہ جمہوریت کی وہ بنیاد اکھڑ جاتی ہے جس پر اس نظام کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔

بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم کی رو سے نظامِ حکومت کی اطاعت بھی اُس وقت تک ہے جب تک وہ نظام ضابطۂ خداوندی کے مطابق احکام صادر کرے۔ اس لئے کہ وہ نظام تو قائم ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ احکامِ خداوندی نافذ کرے گا۔ اگر وہ خود ہی ان احکام کی خلاف ورزی کرنے لگ جائے تو اس کے وجود (یا باقی رہنے) کی وجہ جواز ختم ہو جاتی ہے۔ ایسی حکومت کی جگہ دوسری حکومت آجانی چاہیئے جو ضابطۂ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے صحیح نظامِ خداوندی کے خلاف بغاوت جرمِ عظیم ہے اور اس کی سزا بڑی سخت (۵/۳۳)۔ لیکن اس کی رُو سے ایسی بغاوت جرم ہے جو بغیر الحق ہو (۴۲/۴۲؛ ۴۲/۴۱؛ ۷/۳۳)۔ حق کے خلاف جانے والی حکومت سے تو تعاون تک بھی جائز نہیں (۵/۲)۔

لیکن یہ مقام بڑا نازک ہے اور گہرے فکر کا محتاج۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ حق ہر فردِ معاشرہ یا افراد کے کسی گروہ کو حاصل ہوا ہے کہ وہ حکومت کی جس بات کو اپنی رائے میں غلط سمجھے اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہو اور حکومت کا تختہ الٹنے کے درپے ہو جائے۔ اسلامی حکومت امت کے مشورے سے قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا اس بات کا فیصلہ بھی امت کے مشورہ ہی سے ہو گا کہ کسی قائم شدہ حکومت کو برقرار رکھا جائے یا اسے بدل دیا جائے۔ اس نکتہ کے متعلق مزید گفتگو آگے چل کر کی جائے گی۔

برادرانِ عزیز! آپ نے پہلے یہ دیکھ لیا تھا کہ نظامِ جمہوریت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور یہ دیکھ لیا کہ قرآنی نظام کی عمارت کن اصولوں پر استوار ہوتی ہے۔ اس کے بعد آپ خود اندازہ فرما لیجئے کہ کیا مغرب کے جمہوری نظام کو کسی صورت میں بھی اسلامی کہا جا سکتا ہے؟ اسے اسلامی کہنا تو ایک طرف، یہ اسلام کی نقیض ہے۔ اس کی ضد ہے۔ اس میں کہیں خدا

پاکستان اور جمہوریت

آتا۔ وحی نہیں آتی۔ وحی پر مبنی مستقل اصول نہیں آتے۔ غیر متبدل اقدار نہیں آتیں۔ وہ دہریت پر مبنی سیکولر نظام ہوتا ہے۔ اسے اسلام سے کیا واسطہ؟

کہا یہ جائے گا کہ ہم نے اپنے ہاں اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ مملکت کا مذہب اسلام ہوگا۔ اس میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ مملکت اپنا کاروبار حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دے گی۔ ہمارے ہاں کی جمہوریت ان شرائط سے مشروط ہے، اس لئے یہ اسلامی ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہمارا نظام جمہوری ہوگا تو اس سے درحقیقت یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں ملوکیت یا آمریت کا نظام نہیں ہوگا۔ ہم جمہوریت کے لفظ کو اس کے لغوی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

اصطلاحات کا استعمال

اس جواب کا جائزہ دو پہلوؤں سے لینا ہوگا۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جب کوئی لفظ اصطلاح کی شکل میں مستعمل ہونے لگ جائے تو وہ اپنا لغوی مفہوم کھو دیتا ہے۔ اس کے بعد آپ جب بھی اس لفظ کا استعمال کریں گے تو وہ اپنے ان تمام مضمرات اور لزومات کو ساتھ لائے گا جن سے وہ نظریہ یا نظام عبارت ہے جس کے لئے وہ اصطلاح وضع کی گئی تھی ہمارے ہاں ہو یہ رہا ہے کہ ہم اہلِ مغرب کی مروجہ اصطلاحات کو اپنے ہاں رائج کر لیتے ہیں اور جب ان مضمرات کو سامنے لا کر کہا جاتا ہے کہ یہ خلافِ اسلام ہیں تو کہہ دیا جاتا ہے کہ ہم صرف اس اصطلاح کو لے رہے ہیں اس کے مضمرات کو نہیں لیتے۔ ہمارے ہاں اس کے مضمرات اسلام کے مطابق ہوں گے۔ یہ جواب یا تو جہالت پر مبنی ہوتا ہے اور یا منافقت پر۔ آپ کسی اصطلاح کو اس کے مضمرات سے الگ کر ہی نہیں سکتے۔ آپ اس حقیقت کو خود اپنے ہاں کی اصطلاحات کی روشنی میں سمجھئے۔ ہمارے ہاں (دین میں) وحی، نبوت، رسالت (وغیرہ) اصطلاحات خاص مضمرات کی حامل ہیں۔ اگر قرآن نے ان مادوں کے مشتقات کو بعض مقامات پر ان کے لغوی معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے لئے وحی، نبوت، رسالت کے الفاظ استعمال کرے اور اعتراض کرنے پر کہہ دے کہ میں انہیں ان کے لغوی معنوں میں استعمال کرتا ہوں تو اس کا یہ جواب قابلِ پذیرائی نہیں سمجھا جائے گا۔ اس لئے کہ یہ الفاظ دین کی اصطلاحات بن چکے ہیں جن سے ان کے مضمرات الگ نہیں کئے جا سکتے۔ ختمِ نبوت کے بعد، مسلمانوں میں ان الفاظ کا استعمال کسی کے لئے بھی جائز نہیں قرار پا سکتا۔ یہی صورت جمہوریت کی اصطلاح کی ہے۔ اسے آپ لاکھ "مسلمان" کیجئے یہ "کافر کی کافر" ہی رہے گی۔ اس کا بھی مظاہرہ حال ہی میں ہو چکا ہے۔

عملی مثال

ہم نے اپنے آئین میں وہ تمام شقیں رکھی ہیں جن کی موجودگی میں آپ کا دعویٰ ہے کہ ہماری جمہوریت مغربی جمہوریت نہیں رہی۔ آپ نے کہا یہ کہ ہماری جمہوریت کتاب و سنت کے تابع اور حدود اللہ کے اندر محدود ہے۔ لیکن جب مجلسِ قانون ساز میں اس نکتہ پر بحث ہوئی تو آپ نے

دیکھا کہ آپ کے سامنے کونسی جمہوریت آئی؟ سوال زیرِ بحث یہ تھا کہ جب کوئی مسودہ قانون پارلیمان کے زیرِ غور آئے گا تو اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ وہ کتاب و سنّت کے مطابق اور حدود اللہ کے اندر مقیّد ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں پہلے یہ تجویز کیا گیا کہ اس کا فیصلہ اسلامی مشاورتی کونسل کرے گی۔ لیکن جب یہ دیکھا گیا کہ آئین میں اس کونسل کی حیثیت محض مشاورتی رکھی گئی ہے تو اس مقصد کے لئے کسی اور اتھارٹی کی تلاش ہوئی۔ تجویز کیا گیا کہ اس مقصد کے لئے سپریم کورٹ کو اتھارٹی قرار دے دیا جائے۔ ان تجاویز کے جواب میں صدرِ مملکت نے فرمایا کہ ان میں سے کوئی تجویز بھی اختیار کی جائے، اس سے پارلیمان کی (SUPREMACY) باقی نہیں رہتی اور یہ چیز اصولِ جمہوریت کے خلاف ہے۔ آپ نے دیکھا کہ آئین کو اتنی شرائط سے مشروط کرنے کے باوجود جمہوریت اسلامی نہیں بن سکی۔ اس کا تصوّر مغربی ہی رہا جس کی رو سے (SUPREMACY) پارلیمان کے اراکین کی اکثریت کو حاصل ہوتی ہے اور یہ کسی خاص ذہن کا قصور نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ (جیسے کہ کہا جا چکا ہے) کسی اصطلاح کو اس کے مضمرات سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ (DEMOCRACY) میں (CRACY) حکومت (DEMO) یعنی عوام کی ہوتی ہے۔ جس طرح (AUTO - CRACY) میں (CRACY) (AUTO) یعنی ایک شخص کی ہوتی ہے۔ اسلام میں (CRACY) نہ ایک شخص کی ہو سکتی ہے نہ عوام کی۔ اس لئے اسلامی نظام نہ ڈیموکریسی ہو سکتی ہے نہ آٹوکریسی۔ اس میں (CRACY) کتاب اللہ کی ہوتی ہے اور یہ وہ نظریہ ہے جو دنیا میں کہیں اور موجود نہیں۔ اور تو اور تھیاکریسی کی اصطلاح بھی اس مفہوم کی حامل نہیں۔ اس لئے وہ بھی خلافِ اسلام ہے۔ اسلامی تصوّر حکومت اور نظامِ مملکت بالکل منفرد ہے۔ اس لئے اس کے لئے اصطلاح بھی اپنی اور منفرد ہونی چاہیئے۔ مفہوم کے اعتبار سے میں اسے (QURANO - CRACY) کہوں گا۔ اصطلاح کی اہمیت کے متعلق میں ایک اور مثال پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ جمہور یا جمہوریت کا لفظ تو قرآن میں نہیں آیا لیکن اس نے اسلامی حکومت قائم کرنے والوں کو اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (۹/۱۱۲) کہا ہے۔ اٰمِرُوْنَ۔ اٰمِرٌ کی جمع ہے۔ اس لفظ کی جہت سے جماعتِ مومنین کے قائم کردہ نظام کو آمریت کہا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ اس لفظ کو اختیار کرنا تو ایک طرف اسے سننا بھی پسند نہیں کریں گے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ آمریت (ڈکٹیٹرشپ) عصرِ حاضر کی ایک خاص اصطلاح ہے جو اپنے مضمرات کے اعتبار سے اسلام کے خلاف ہے۔ آپ سوچئے کہ کیا یہ چیز تعجب انگیز نہیں کہ ہم آمریت کی اصطلاح کو تو اس قدر مذموم تصوّر کرتے ہیں (حالانکہ قرآن نے مومنوں کو آمرین کہا ہے) اور جمہوریت کی اصطلاح کو چوم کر گلے سے لگاتے ہیں حالانکہ یہ بھی اسی طرح خلافِ اسلام ہے جس طرح آمریت۔ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائیگی کہ ہم نہ آمریت کو اس لئے مذموم سمجھتے ہیں کہ یہ اسلام کے خلاف ہے نہ جمہوریت کو اس لئے محبوب کہ یہ اسلام کے مطابق ہے۔ ہم آمریت کو اس لئے ناپسند کرتے ہیں کہ مغرب نے اسے مردود قرار دیا ہے اور جمہوریت کو اس لئے

پسند کہ یورپ نے اسے محبوب قرار دیا ہے۔ (غلامی سے متاثر محکوم ذہنیت میں ہوتا ہی یہ ہے)۔ اس کے بعد ہم
جمہوریت کے خلاف دلائل کے انبار لگا دیتے ہیں اور جمہوریت کے حق میں براہین کے قنطار۔ اقبالؒ نے جب اتنا
عرصہ پہلے کہہ دیا تھا کہ جمہوریت کے سازِ کہن میں وہی نوائے قیصری ہے اور جلالِ پادشاہی اور جمہوری تماشہ
دونوں کا نتیجہ چنگیزیت، تو یہ اس لئے کہ اس کی فکر غلامانہ نہیں تھی۔ اس نے اپنے متعلق کہا تھا کہ

فکرِ اقبالؒ غلامانہ نہیں تھی

میانِ آب و گِل خلوت گزیدم — ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزہ چشم — جہاں را جز بچشمِ خود ندیدم

مجھے اس سے اختلاف نہیں کہ فکرِ اقبال میں بھی بعض مقام پر اسقام ہو سکتے ہیں لیکن یہ اس کی فکر کی اجتہادی
لغزشیاں ہیں۔ (ان کا دعوےٰ بہرحال ایک مفکر کا تھا "مامور من اللہ" کا نہیں تھا)۔ بااین ہمہ انہوں نے اسلام اور
اس کے نظام کے متعلق جو کچھ اصولی طور پر کہا ہے وہ حقائقِ قرآن پر مبنی ہے اور ان حقائق میں ایک بنیادی
حقیقت یہ ہے کہ

> اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور
> ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں
> بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلام ہو، نامعقول و مردود ہے۔

یہ بات انہوں نے (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کے اس بیان کے جواب میں کہی تھی جس میں انہوں نے (مولانا مرحوم
نے) وطنیت اور جمہوریت کو مطابقِ اسلام قرار دینے کی کوشش کی تھی۔ مسلمانوں کی یہی وہ غلامانہ مستعار ذہنیت
تھی جس کے احساس سے انہوں نے بحضور رسالتمآبؐ بصد کرب و سوز فریاد کی تھی کہ

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر — میری دانش ہے افرنگی میرا ایماں ہے زناری

ہمارے جدت پسند طبقہ کی یہی دانشِ افرنگی اور مذہب پرست طبقہ کا زناری ایمان ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ایک
مملکت کے وارث ہونے کے باوجود غلاموں کے بھی غلام ہوتے جا رہے ہیں۔ یاد رکھئے۔ ایمانِ خالص جو نتائج
اندر رکھتا ہے ان کا تو کہنا ہی کیا۔ کفرِ خالص بھی اپنے اندر کچھ نتائج رکھتا ہے۔ لیکن جب کفر اور اسلام میں
پیوند سازی شروع کر دی جائے تو اس سے نہ اسلام کے نتائج حاصل ہو سکتے ہیں نہ کفر
کے۔ اس سے قوموں کے اعمال غارت ہو جاتے ہیں اور مساعی ناشکور۔ ہم نے اپنے ہر آئین

پیوند سازی

میں اس کا اعلان کیا کہ مملکتِ پاکستان میں حاکمیت خدا کی ہوگی لیکن عملاً یہاں ایک دن بھی خدا کی حاکمیت دیکھنے
میں نہ آئی۔ عملاً یہاں نظام وہی مغربی جمہوریت کا رائج رہا اور ہماری ساری بحثیں اس قسم کے مسائل پر مرکوز رہیں کہ

یہ نظام برطانیہ کے انداز کا پارلیمانی ہو یا امریکہ کے طرز کا صدارتی۔ ان مباحث میں مغرب زدہ "مسٹر" بھی شامل ہیں اور اسلام کے علمبردار حضرات بھی برابر کے شریک۔ اسلام کے ان مزعومہ علمبرداروں میں جماعت اسلامی کا نام سرفہرست آتا ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران اس جماعت کے امیر ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، دھڑلے سے اعلان کیا کرتے تھے کہ پاکستان میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے اختلاط سے جو جمہوری نظام قائم ہوگا وہ درحقیقت مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی (ترجمان القرآن، بابت محرم ۱۳۶۶ھ)۔ لیکن پاکستان میں پہنچ کر ان کے نزدیک جمہوریت عین مطابق اسلام قرار پاگئی اور اس میں کافر اور مسلم کی تمیز بھی ختم کردی گئی۔ چنانچہ مودودی صاحب نے صدر ایوب کے دور کے انتخابات کے زمانے میں ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ

> اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی اس لئے کہ اس نے یہ اصول تسلیم کرلیا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریہ کے مطابق ہونا چاہیئے۔
>
> (امروز ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء)

یہ تھی وہ جمہوریت جس کی بحالی کے لئے انہوں نے ۱۹۶۸-۶۹ء کی مہم کو عین تقاضائے اسلام قرار دیا تھا۔ یعنی وہ نظام جس میں فیصلے اکثریت کی آراء کے مطابق ہوں خواہ یہ اکثریت مسلمانوں اور کافروں کی مخلوط ہی کیوں نہ ہو۔

اکثریت کے فیصلوں کے برحق ہونے کا یہی اصول ان کے نزدیک قانون سازی کے سلسلہ میں بھی کارفرما ہوگا۔ چنانچہ جب یہ سوال سامنے آیا کہ ملک میں کونسا قانونِ شریعت نافذ ہوگا تو انہوں نے فرمایا کہ

> اگر شریعت کو ملک کا دستور اور آئین بنانا ہے (جس سے کوئی مسلمان انکار کی جرأت نہیں کرسکتا) تو جمہوریت کے مسلم قاعدہ کے مطابق یہاں شریعت کی وہی تعبیر دستور اور آئین کی شکل اختیار کرے گی جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت معتبر مانتی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے .... لہٰذا اس کا قانون حنفی تعبیر شریعت پر مبنی ہوگا۔ (ترجمان القرآن، بابت جون، جولائی ۱۹۵۲ء)

یہ اُس حنفی فقہ کی بات کہی جا رہی ہے جس کے متعلق اس سے پہلے خود مودودی صاحب لکھ چکے ہیں کہ

> اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ (سیاسی کشمکش حصہ سوم ص۳۶)

یعنی ایک "منجمد شاستر" تک کو ملک کو قانونِ شریعت بنا دیا جائے گا کیونکہ اسے "جمہوریت کے مسلم قاعدہ کی رو اکثریت کی تائید حاصل ہے"؟ "یہ مسلم قاعدہ" بہرحال مغربی جمہوریت ہی کا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے "مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ

> اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ

ایک ایک شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلہ میں برحق ہو اور اگر ایسا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جمِّ غفیر نہیں۔ (اسلام کا نظریہ سیاسی، ص ۴۵)۔

[ا]س کے باوجود، کہا یہ جا رہا ہے کہ جس قانون کو اکثریت کی تائید حاصل ہوگی وہی ملک کا قانون بن سکے گا کیونکہ جمہوریت کے مسلّم قاعدہ کا یہی تقاضا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ آئین میں لفظی طور پر "خدا کی حاکمیت" "کتاب وسنت" اور "حدود اللہ" جیسے مقدس الفاظ شامل کرنے والوں کے ذہن میں عملی جمہوریت کا نقشہ کیا ہے اور اس میں کس طرح مسٹر و مولانا میں کوئی تمیز و تفریق نہیں۔

آئین میں خدا کی حاکمیت کے الفاظ کا اندراج اور عملاً اکثریت کے فیصلوں کی بالادستی پر ایمان، اگر اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے "تحاکم الی الطاغوت" نہیں تو اور کیا ہے؟

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ مغربی نظریہ اور نظامِ جمہوریت کس طرح اسلام کی نقیض ہے اور خدا کی حاکمیت اور حدود اللہ کے تصورات کس طرح اس میں فٹ نہیں بیٹھتے۔ نظام یا جمہوری ہو سکتا ہے یا خدا کی حاکمیت پر مبنی۔ اور یہ حقیقت بھی آپ پر واضح ہو گئی ہوگی کہ خدا کی حاکمیت سے عملاً مراد کتاب اللہ کا اقتدارِ مطلق یا ساورنٹی ہے اور یہ بات بھی آپ نے سمجھ لی ہوگی کہ مسلمان اپنے آپ کو آزاد اسی صورت میں تصور کر سکتا ہے جب اس پر حاکمیت صرف کتاب اللہ کی ہو۔ اقبالؒ نے جب کہا تھا کہ

گر تو می خواہی مسلمان زیستن — نیست ممکن جز بقرآن زیستن

تو اس سے اس کا مطلب یہی تھا۔ اقبالؒ نے یہ بات مجملاً کہی تھی۔ قائداعظمؒ نے اس اجمال کی تفصیل ان زندہ جاوید الفاظ میں بیان کر دی جو میرے نزدیک اسلامی مملکت کے آئین کا سرنامہ ہونا چاہیئے۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔

کہا جائے گا کہ جمہوریت یا ڈیموکریسی کے الفاظ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے بھی استعمال کئے ہیں۔ لیکن خود ان کی مندرجہ تصریحات کی روشنی میں یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اس سے ان کی مراد مغربی طرزِ جمہوریت کسی صورت میں

نہیں ہو سکتی تھی. اس سے ان کا مقصود یہی ہو سکتا تھا کہ ہمارا طرزِ حکومت آمریت (ڈکٹیٹرشپ) نہیں ہوگا. بایں ہمہ غلط اصطلاحات کی وجہ سے پیدا شدہ تخریبی نتائج کا جو عملی تجربہ ہمیں یہاں ہوا ہے اس کی روشنی میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ اگر اس اصطلاح کو نہ ہی استعمال کرتے تو اچھا تھا. بہرحال انہوں نے اسے استعمال کیا یا نہ کیا اور اگر کیا تو کن معانی میں' اس سے ہمارے موقف پر کچھ اثر نہیں پڑتا. ہمارے نزدیک سند اور حجت خدا کی کتاب ہے نہ کسی انسان کا قول. اس لئے خدا کی کتاب کے خلاف اگر کوئی شخص' اقبال اور جناح کا بھی کوئی قول پیش کرتا ہے تو قرآن کی رُو سے وہ سند نہیں ہو سکتا. اس باب میں قولِ فیصل یہی ہے کہ

ہماری آزادی اور پابندی کے حدود قرآنِ کریم کے احکام و اصول ہی متعین کرتے ہیں (قائداعظم)

اسی کا نام اسلام ہے اور اسی کا نام آزادی.

لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ کتاب اللہ کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہماری مذہبی پیشوائیت ہے. اس نے ہر زمانے میں ہر اس شخص کی مخالفت کی جس نے ما انزل اللہ کو بطور سند اور حجت پیش کیا — خواہ وہ خدا کا کوئی رسول تھا اور خواہ ان رسولوں کا کوئی تبع. شروع سے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور آج بھی یہی ہو رہا ہے. یہ لوگ زبان سے کتاب اللہ کی حاکمیت کا انکار نہیں کرتے' ان کی تکنیک یہ ہوتی ہے کہ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ. (۲/۷۹)

"خود قوانین وضع کرتے ہیں اور انہیں شریعتِ خداوندی کہہ کر پیش کرتے ہیں" اس طرح انسانوں کے وضع کردہ احکام و قوانین' کتاب اللہ کی جگہ لے لیتے ہیں.

کیا کیا جائے؟

سوال یہ ہے ان حالات میں کیا کیا جائے. میں اس سوال کے جواب کو کسی خاص خطۂ سرزمین تک محدود نہیں رکھنا چاہتا. اس لئے کہ جو کچھ میں نے اوپر عرض کیا ہے وہ پاکستان تک محدود نہیں. اس وقت مسلمانوں کے تمام ممالک میں صورتِ حالات کم و بیش یہی ہے. اس لئے میں اپنے جواب میں یہ کہوں گا کہ جو مملکت بھی یہ چاہتی ہے کہ وہ ایک خدا کی محکومی اختیار کرکے' انسانوں کی ہر قسم کی محکومیت سے آزادی حاصل کرے. خواہ اس حکومت کی شکل ملوکیت ہو یا آمریت' اور خواہ عصرِ حاضر کا جمہوری نظام ہو. اسے کرنا یہ ہوگا کہ:

۱. اپنے آئین میں صاف کہہ دے گا کہ اس مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ قرآنِ مجید کو حاصل ہوگا.

۲. مملکت کا نظم و نسق قرآنی اصول و اقدار کو عملاً نافذ کرنا ہوگا.

۳. یہ بات اس مملکت کے مسلمان باشندوں کے باہمی مشوروں سے طے کی جائے گی کہ ان اصول و قوا

کو بحالاتِ موجودہ نافذ کرنے کا طریقِ کار کیا ہوگا۔ اس مشاورت کی مشینری خود تجویز کی جائے گی۔ اس مجلس مشاورت کو آپ پارلیمان کہہ لیجئے۔ پارلیمان میں کوئی پارٹی نہیں ہوگی کہ قرآنِ کریم کی رو سے مذہبی فرقہ سازی یا پارٹی سازی شرک ہے۔ پارلیمان کی رکنیت کے لئے بنیادی شرط قرآنی احکام و اقدار سے واقفیت ہوگی۔

۴۔ یہ سوال پیدا ہوتا رہے گا کہ اگر پارلیمان میں اس بات پر اختلاف ہو جائے کہ جو کچھ طے کیا جا رہا ہے وہ قرآنی تعلیم کے مطابق ہے یا نہیں یا عام افرادِ معاشرہ میں یہ خیال پیدا ہو کہ پارلیمان جو فیصلہ کر رہی ہے وہ قرآن کے مطابق نہیں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ میری بصیرت کے مطابق اس کا حل یہ ہے کہ ملک کی بلند پایہ عدلیہ کے ارکان، ممتاز قانون دان حضرات اور قرآنِ کریم پر گہری نگاہ رکھنے والے اربابِ علم و بصیرت پر مشتمل ایک مجلس قائم کی جائے جس کے سامنے اختلافی امور پیش ہوں۔ اس مجلس کے اراکین اس شرط سے مشروط ہوں کہ وہ کسی خاص مسلک کو نہیں بلکہ قرآنِ مجید کو آخری سند و حجت تسلیم کرتے ہیں وہ ان اختلافی امور پر غور و خوض کے سلسلہ میں ملک کے مختلف اربابِ علم و دانش کے مشوروں سے استفادہ کریں اور اس کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچیں۔ ان کا فیصلہ اس باب میں حرفِ آخر تسلیم کیا جائے۔ یہ اعتراض کہ اس طرح بالادستی (SUPREMACY) پارلیمان کی نہیں بلکہ اس مجلس کی ہو جائے گی، بے معنی ہوگا۔ اس لئے کہ قرآنی نظام میں بالادستی نہ پارلیمان کی ہوتی ہے نہ کسی اور مجلس کی۔ اس میں بالادستی کتاب اللہ کی ہوتی ہے اور ان مجالس کا منصب صرف یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ معاملہ زیرِ نظر میں کتاب اللہ کا حکم کیا ہے۔ اگر کوئی حکومت ان کے فیصلے کو تسلیم نہ کرے تو ایسی مجلس کو ایسے اختیارات اور قوت حاصل ہونی چاہیئے کہ وہ اسے اس فیصلہ کے تسلیم کرنے پر مجبور کر سکے اور بہ صورتِ دیگر اسے برطرف کر سکے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں "بغاوت بالحق" کہا جائے گا۔ یہ حق کسی اور کو حاصل نہیں ہونا چاہیئے، نہ کسی فرد کو نہ افراد کے مجموعہ کو۔

یہ ہے میری بصیرت کے مطابق اس طریق کا مختصر سا خاکہ جس کی رو سے اس مملکت میں کتاب اللہ کی حاکمیت قائم ہو سکے گی اور اس کے بعد وہاں کے افرادِ معاشرہ بہ ہزار سرفرازی یہ کہہ سکیں گے کہ ہم دنیا میں کسی کے محکوم نہیں، ہمیں حقیقی آزادی حاصل ہے اور اس وقت اقبالؒ کے اس پیغام کا عملی مفہوم بھی سمجھ میں آ سکے گا کہ:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اور یہی تھا وہ سجدہ جسے وادیٔ صبحنآن میں ادا کرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ ایک دن وہ تھا کہ میں اس وادی میں اونٹ چرایا کرتا تھا۔ باپ سخت گیر تھا۔ کام بھی لیتا تھا اور پیٹتا بھی تھا اور آج یہ کیفیت ہے کہ عمر اور اس کے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں۔ یہی مفہوم ہے قرآن کریم کی اس آیۂ جلیلہ کا جس میں کہا گیا ہے

کر وَ اسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ (۹۶/۱۹) "سجدہ کر اور قریب ہو جا" اسی سے آدمی کو مقامِ انسانیت حاصل ہوتا ہے۔ اسی سے اُسے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کی جنت کی زندگی حاصل ہے جس میں نہ کسی قسم کا خارجی خطرہ ہوتا ہے نہ کسی نہج کا داخلی حزن و ملال ۔۔۔ ایک خدا کے سامنے جھکنا اور دنیا کی بڑی سے بڑی چوکھٹ کے آگے سے سکندرانہ جلال اور قلندرانہ اداؤں کے ساتھ مستانہ وار گزر جانا۔ قرآن کے اسی تصورِ حکومت سے متاثر ہو کر مشہور فرانسیسی مفکر برگسان نے کہا ہے کہ "مملکت کا اقتدار انسانوں پر نہیں، اشیاء پر ہونا چاہیئے تاکہ ایک انسان کا دوسرے انسان پر کوئی اختیار نہ ہو" اس لئے کہ (THE MAKING OF HUMANITY) کے مشہور مصنف برفا کے الفاظ میں:

> ایک انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار و اختیار خواہ وہ کسی رنگ میں ہو استبداد ہے۔ قوت کسی شکل میں ہو اس کے یہی نتائج ہوں گے۔ وہ جاہ و منصب کی ہو یا پنجۂ فولاد کی، دولت کی ہو یا محض ذہنی برتری کی، دفاتری زندگی میں کسی افسر کی ہو یا حاکم کی، کسی پادری کی ہو یا پروہت کی۔ قوت بہرحال قوت ہے اور فساد کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیداد گری ہوتا ہے اور ان میں سب سے زیادہ خراب قوت وہ ہے جو اکثریت محض اپنی تعداد کے زور پر اقلیت کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ (صـ ۲۷۳)

اور اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اقتدار صرف قوانینِ خداوندی کو حاصل ہو۔ اسی کا نام آزادی ہے۔

مملکتِ پاکستان کی حفاظت

آخر میں، میں اتنی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ جو مملکت بھی حاکمیت کا اقرار کرے، خواہ وہ اقرار لفظی ہی کیوں نہ ہو، اس کی سرزمین کی حفاظت مسلمان کا دینی فریضہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ خطۂ زمین محفوظ رہے گا تو خدا کی حاکمیت کے زبانی رٹنے کے عملی صورت اختیار کرنے کا امکان ہوگا۔ لیکن اگر وہ خطۂ زمین ہی محفوظ نہ رہا تو خدا کی حاکمیت قائم کہاں ہو سکے گی؟ آج کوئی مسلمان اسپین کی سرزمین میں خدا کی حاکمیت کا نام تو لے کر بتائے!

لیکن (بفرضِ محال) اگر یہاں خدا کی حاکمیت کا آئینی اقرار نہ بھی ہو تو بھی اس مملکت کا تحفظ بہرحال ضروری ہے۔ اس لئے کہ یہاں کی بدسے بدتر زندگی بھی ہندو کی بالواسطہ یا بلاواسطہ غلامی سے بہرحال بہتر ہوگی۔ لہٰذا جہاں تحریکِ پاکستان کے دوران اسی قسم کے نعرے نہایت شر انگیز تھے کہ

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے..... اور

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کو بھی کوئی اہمیت حاصل نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔

(ابوالاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن، بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ)

اسی طرح آج بھی اس قسم کے خیالات کا عام کرنا کم تباہی کا موجب نہیں کہ ہمارے مستقبل کی حفاظت کی ایک ہی صورت ہے کہ پاکستان، بھارت کے ساتھ وابستہ ہو جائے — خواہ اس میں ضم ہو کر یا کنفیڈریشن کے ذریعے۔ ایسا کہنے والے اسلام ہی کے نہیں، ہمارے بہ حیثیت زندہ رہنے کے بھی دشمن ہیں۔ یاد رکھئے۔ یہ خطۂ زمین محفوظ ہے، تو اسلام کے دوبارہ زندہ ہو جانے یا ہمارے بہ حیثیت انسان باقی رہنے کے امکانات ہیں اور اگر (خدانخواستہ) — رہا نہ یہ تو نہ سوزِ خودی نہ سازِ حیات —

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے معاشرہ میں بگاڑ ہی بگاڑ ہے لیکن اس سے بڑھ کر احمق کون ہوگا جو مایوسی سے مغلوب ہو کر، راستے میں بگڑ جانے والے موٹر کو آگ لگا دے۔ والسلام

قارئین، یہ تھا وہ خطاب جو علامہ پرویزؒ نے یومِ آزادی ۱۲۔ اگست ۱۹۷۳ء کو دیا۔ یہ آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہے جیسے اکیس سال قبل تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ قرآن کی صداقتوں پر مبنی ہے اور قرآنِ کریم کا یہ اعجاز ہے

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

(مدیر ادارہ)

حدیث النبیؐ

مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی مزدوری دے دو۔ (ابن ماجہ)

ڈاکٹر محمد صدیق

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۚ ..... تَاْوِیْلًا ۝ (۴/۵۹)۔ ان الفاظ کا عام سا ترجمہ تو یہ ہے کہ "اے اہلِ ایمان! اطاعت کرو اللہ کی، رسول کی اور اپنے میں سے صاحبانِ امر کی۔ اور اگر تم میں کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو اللہ و رسول سے رجوع کرو۔ اگر تم اللہ اور آخرت پر یقین رکھتے ہو تو تمہارے لئے بہتر دستور العمل یہی ہے"۔

آیۂ زیرِ نظر میں اسلامی نظامِ حکومت کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اللہ سے مراد کتاب اللہ کی اطاعت، رسول سے مراد کتاب اللہ کو نافذ کرنے والی اتھارٹی یعنی مرکزِ ملت (اسلامی حکومت کا سربراہ) اور اولی الامر سے مراد حکومتی مشینری یعنی مرکزی حکومت کے ماتحت افسران ہیں۔

کسی بھی نظامِ حکومت کے یہی تین اہم اجزا ہوتے ہیں۔

۱۔ قانون۔
۲۔ قانون کو نافذ کرنے والی محسوس شخصیت (مرکز)۔ (اس لئے کہ اس کے بغیر قانون کی اطاعت نہیں کی جا سکتی)۔
۳۔ مرکز کے ماتحت کام کرنے والی حکومتی مشینری (افسرانِ ماتحت)۔

افسرانِ ماتحت، مرکز کی طرف سے جاری کردہ احکامات پر عمل کروانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی اطاعت مرکز کی اطاعت ہوتی ہے۔ چونکہ مرکز قانون کی اطاعت کرواتا ہے۔ لہٰذا وہ اطاعت اصل میں مرکز نہیں، قانون کی ہوتی ہے۔ مرکز کو قرآن رسول سے تعبیر کرتا ہے۔ لہٰذا رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس لئے فرمایا۔

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ

"اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ" قرآن کی عظیم اصطلاح ہے جس سے مراد اسلامی حکومت کی اطاعت ہے۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کے الفاظ قرآن عظیم میں متعدد مقامات پر اکٹھے آئے ہیں۔ ان سے مراد الگ الگ دو اطاعتیں نہیں بلکہ ایک ہی اطاعت اور اسلامی حکومت کی اطاعت مراد ہے۔

اگر یہاں دو الگ الگ اطاعتیں مراد ہوتیں تو یہ چیز قرآن عزیز کے اپنے ہی بنیادی اصول کے خلاف ہوتی جب فرمایا کہ کسی بشر کو خواہ کتاب و نبوت ہی کیوں نہ دی جائے اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ کے علاوہ اپنی اطاعت کروائے (آل عمران: ۳۹)۔

ان الحکم الا للہ حق حکومت سوائے اللہ کے کسی کو حاصل نہیں (انعام: ۵۷)۔ اکثر مقامات پر اللہ و رسول کا (اکٹھا) ذکر کر کے صیغہ واحد لایا گیا ہے۔ مثلاً یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ..... (۸/۲۴)۔ اس میں دَعَا صیغہ واحد ہے۔ اگر یہاں اللہ و رسول سے مراد دو ذاتیں ہوتیں تو صیغہ تثنیہ ہوتا مگر اس سے مراد ایک ادارہ یعنی اسلامی حکومت ہے۔ ہمارے دور میں اسے سمجھنا اور بھی آسان ہے اس لئے کہ حکومت کے لئے صیغہ واحد ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں بیان یہ کیا گیا ہے کہ اسلامی نظام حکومت میں اطاعت، اللہ کے قانون (قرآن عظیم) کی ہوگی۔ اسے نافذ کرنے والی ایک محسوس شخصیت ہوگی۔ رسول یا اس کا جانشین اور مختلف علاقوں اور شعبوں میں انتظامی امور کے لئے ماتحت افسران متعین کئے جائیں گے اور پھر اگر ان کے درمیان کسی نزاع میں مرکز سے رجوع کیا جائے گا۔

اور پھر وضاحتاً و تاکیداً فرمایا کہ اس وقت تک کتاب اللہ کی اطاعت ممکن نہیں اس وقت تک معاشرہ اسلامی نہیں ہو سکتا جب تک ایک مرکزِ امت نہ ہو۔ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ (اللہ اس پر شاہد ہے کہ جب تک تجھے اپنے متنازعہ فیہ امور میں حکم نہ مان لیں یہ لوگ ایمان والے نہیں ہو سکتے) (النساء: ۶۵)۔

یہاں یُحَكِّمُوْكَ میں "ك" سے مراد رسول اور رسول اللہ کے بعد رسول کا جانشین، خلیفۃ الرسول مراد ہے کیونکہ یہ نظام رسولؐ اللہ کی زندگی تک کے لئے ہی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ رسول سے مراد قانون نافذ کرنے والی مرکزی اتھارٹی (محسوس شخصیت) ہے اور یہی اس کا صحیح قرآنی مفہوم ہے جو کہ رسولِ کریمؐ اور صحابہ کرامؓ نے لیا اور اس پر عمل کیا۔ اسی لئے رسولِ خدا نے ارشاد فرمایا۔ علیکم بسنتی وسنت الخلفاء الراشدین المهدیین (مشکوٰۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنہ)۔

حضورِ اقدسؐ کا یہ ارشاد قرآن کریم کی سورۃ النساء کی آیت (۱۱۵) کی عملی تعبیر ہے جس میں فرمایا گیا کہ "جو رسولؐ کی مخالفت کرے اور مومنین کے طریق سے ہٹ جائے تو اس کا تعلق جماعتِ مومنین سے نہیں، گروہِ مخالف سے

ہے اور ہم اسے جہنم میں ڈالیں گے"۔

معزّزینِ گرامی! اسی طریق کو چھوڑ کر آج ہم جہنم کی زندگی گذار رہے ہیں۔ یہ پوری دنیا میں ہماری رسوائی و پسپائی جہنمی زندگی نہیں تو اور کیا ہے۔

اور بھی کوئی سزا کیا ہوگی، اس کے بعد بھی
اے خدا کس کس خدا کی بندگی ہم سے ہوئی

رسولؐ اللہ کے ذمہ بحیثیت سربراہِ حکومت دو کام تھے۔

۱۔ کتاب اللہ کو نافذ کرنا۔

۲۔ جن قوانین کو قرآنِ کریم میں محض اصولی طور پر بیان کیا گیا تھا اور ان کی جزئیات نہیں متعین کی گئی تھیں ان کی جزئیات متعین کرنا۔

اور یہی فریضہ اس کے بعد خلیفۃ الرسولؐ کے ذمہ تھا۔

رسولؐ اللہ کے بعد اب اطیعوا الرسول سے مراد اطاعتِ ابوبکرؓ تھی اور یُحَکِّمُوْکَ میں 'ک' سے ذاتِ ابوبکرؓ مراد تھی۔ اسی طرح سیدنا عمرؓ، سیدنا عثمان غنیؓ اور سیدنا علیؓ کی پوزیشن تھی۔

یہ حضرات کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور اصولی قوانین کی جزئیات امت کے مشورہ سے حالات کے تقاضوں کے مطابق متعین کرتے تھے وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)۔ مثلاً سورۂ نساء میں ہے ــــ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ۝ (۴/۷۱)۔ اے اہلِ ایمان! تم دشمن کے مقابلے کے لئے تیار رہو اور وقت آنے پر نکل پڑو (مقابلے کے لئے) سب کے سب اکٹھے یا مختلف دستوں کی صورت میں۔

یہاں نکلنے کا حکم تو اٹل ہے مگر اکٹھے نکلیں یا دستوں کی صورت میں اس میں اختیار (OPTION) ہے اس کا فیصلہ امامِ وقت (امیر) کرے گا حالات کے تحت۔

امام کے اس فریضہ کی نوعیت تین کی طرح کی ہے۔

۱۔ وہ قوانین جو اصولی طور پر قرآنِ عظیم میں بیان ہوئے ہیں ان کی جزئیات متعین کرنا۔

۲۔ پہلے سے متعین جزئیات جن میں تغیر و تبدل کی ضرورت نہ ہو انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دینا۔

۳۔ پہلے سے متعین جزئیات میں اقتضائے وقت کے تحت تبدیلی کرنا پڑے تو ان میں تبدیلی کرنا۔

ایسی بہت سی امثال خلافتِ راشدہ میں ملتی ہیں۔

رسولِ کریمؐ کے عہد میں شراب نوشی کی کوئی سزا مقرر نہ تھی۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ نے اس کی سزا ۴۰ کوڑے

مقرر کی اور پھر حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں اسے بڑھا کر ۸۰ کوڑے کر دیا۔

۲۔ حضرت عمرؓ نے زمینی پیداوار کی مختلف اجناس کی شرح خراج مقرر کی جو پہلے نہ تھی۔

۳۔ مؤلفۃ القلوب کو صدقات سے مدد دی جاتی تھی جو حضرت عمرؓ نے بند کر دی۔

۴۔ مفتوحہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دی جاتی تھیں، حضرت عمر فاروقؓ نے یہ سسٹم بند کر دیا۔

۵۔ حضرت عمرؓ نے تجارتی گھوڑوں پر سمندر سے برآمد اشیاء پر زکوٰۃ نافذ کی جو پہلے نہ تھی۔ (اس طرح تمام اولیاتِ عمرؓ اس میں شمار ہوتی ہیں)۔

۶۔ حضرت عثمانؓ تک اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کا رواج تھا۔ حضرت علیؓ نے بند کر دیا۔ یعنی جو چیز قرآن میں جائز ہو اسے حالات کے پیشِ نظر معطل بھی کیا جا سکتا ہے جیسے

۷۔ حضرت عمرؓ نے جنگ کے زمانہ میں حد جاری کرنا اور قحط کے زمانہ میں چور کا ہاتھ کاٹنا معطل کر دیا تھا۔ اور یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک ڈاکٹر مریض کے پیشِ نظر جائز و حلال اشیاء سے منع کرتا ہے۔

۸۔ حضرت عثمانؓ نے نمازِ جمعہ کے لئے دو اذانیں مقرر کیں۔ اس سے قبل ایک اذان تھی۔

۹۔ حضرت عمرؓ نے اذانِ فجر میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ کیا۔

ایسی ہی کئی اور مثالیں ہیں اور یہ سلسلہ خلافت راشدہ میں جاری رہا۔ اگر خلافتِ راشدہ کا تسلسل جاری رہتا تو بعد کے خلفاء کی بھی یہی پوزیشن ہوتی۔ اگر یہ سلسلہ مقدس ہم تک پہنچتا تو ہمارے وقت کے خلیفہ کی بھی بالکل یہی پوزیشن ہوتی۔ فلا وربك لا یؤمنون یحکموك فیما شجر بینھم (۴/۶۵)۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ وہ سلسلہ جاری نہ رہا۔ خلافت ختم ہوئی۔ اطاعت کروانے والی محسوس شخصیت نہ رہی تو اطاعتِ رسول کا صحیح مفہوم بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اب اطاعتِ رسول کا مفہوم بگڑا اور بزعمِ خویش اطاعتِ رسول کرنے کے لئے احادیث کی ضرورت پڑی اور پھر احادیث کے الگ الگ مجموعے بننے لگے۔ چونکہ احادیث اکٹھی کرنا عام آدمی کے بس میں نہ تھا۔ چنانچہ اہلِ علم کی طرف رجوع ہوا جس سے مذہبی پیشوائیت کا آغاز ہوا اور پھر محمدؐ کے پیغام کا بھی وہی حشر ہوا جو سابقہ انبیاء کی اقوام نے ان کے پیغام کا کیا تھا۔ دین مذہب میں بدلا۔ خلافت ملوکیت میں بدلی۔ مذہبی پیشوائیت کا دور دورہ ہوا۔ مذہب سیاست سے الگ ہوا۔ دو متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں، ایک سلاطین کی اور دوسری مذہبی پیشوائیت کی اور دونوں باہم عدم مداخلت کے اصول پر کاربند ہو گئیں اور یوں ایک نیا معاشرہ کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری معرضِ وجود میں آیا۔

باقی نہ رہی تری وہ آئینہ ضمیری اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

ہر مذہبی پیشوا کا اپنا نقطہ نظر تھا جس کی ترویج و اشاعت کے لئے انہوں نے الگ الگ مدرسے قائم کئے اور یوں فرقہ بندی کا جی بھر کر شوق پورا کیا گیا۔ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حدیثیں بیان کرنے کے شوق میں حدیثیں وضع ہونے لگیں۔ ہر شخص محدث بننے کے چکر میں تھا۔ وہ نبوت جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا اس کا رواج ہوا اور اسلام کے نام پر ہوا۔

فرقہ بندی جو شرک تھی اسلامی فرقوں کے نام سے جانی جانے لگی۔ اب دین کو دنیا سے واسطہ نہ رہا۔ نام نہاد دینداروں کے لئے دنیا مردار قرار پائی اور پھر اوروں (غیروں) نے سنبھالی دنیا۔ یوں مسلم قوم پستی میں گرتی چلی گئی۔ خلافت کا ختم ہونا تھا کہ اس قوم پر ذلت و رسوائی کا عذاب نازل ہوا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اپنی اصلاح کی بجائے خدا کو قصوروار ٹھہرایا جانے لگا۔ جب برائیوں کی سزا ملی تو اپنے جرائم کے نتائج سامنے آئے تو کہا کہ یہ قسمت کا لکھا ہے۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔

یارب میرے گناہ کی عظمت پہ غور کر
اتنی خطا کو تری رضا کہہ گیا ہوں میں

جہاں مسلمان غیر مسلموں کی حکومت میں ہوں وہاں دنیاوی امور (دین و دنیا الگ الگ کر دیئے گئے) میں حکومت کی اطاعت ہوتی ہے اور ذاتی معاملات میں شریعت کی جو مذہبی پیشوائیت متعین کرتی ہے جیسا کہ مذہب میں ہوتا ہے يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ... (۲/۷۹)

باطل کے اقتدار میں تقویٰ کی آرزو
کتنا حسیں فریب ہے، جو ہم کھائے ہوئے ہیں

مرکزِ امت (خلافت) کے نہ رہنے سے یہ سارا انتشار پیدا ہوا۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ مرکز قائم کیا جائے جس کے نہ ہونے سے یہ حالات دیکھنے پڑے۔ یعنی خلافت علیٰ منہاجِ نبوت تو پھر اس آیت کے مطابق تمام اختلافات و تنازعات اور انتشار ختم ہوگا فلا و ربك لا يؤمنون حتّٰى يحكموك فيما شجر بينهم یعنی جب تک تجھے حکم نہ مانیں ایمان دار نہیں ہو سکتے اور ہم نے تو اس "حکم" کا وجود ہی نہ رہنے دیا اور مزے کی بات یہ کہ ہم پھر بھی مومن ہی ہیں۔ تو جان لیجئے کہ ہمارے جیسے بگڑے ہوئے مومنوں سے ہی کہا گیا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا! جناب مومن! ایمان بھی لے آیئے! محض مومن ہونے پر ہی نہ پھرے رہیئے۔

سابقہ اقوام سے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (۷/۹۶)۔

"اگر وہ ہمارے قانون کا اتباع کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے مگر انہوں نے بغاوت کی اور اپنے جرم کی پاداش میں پکڑے گئے۔"

عزیزانِ من! ہم بھی اپنے جرموں کی پاداش میں پکڑے ہوئے ہیں، اگر ہم بھی اتباعِ کتاب اللہ کریں تو ہم بھی برکتوں اور خوشحالیوں کے دروازے کھل سکتے ہیں۔

مسلمانو! یقین جانو کہ اگر ہمیں بطور قوم زندہ رہنا ہے تو پھر یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ تو اللہ و رسول کی آواز پر لبیک کہنا ہوگا۔ اللہ و رسول قرآن کی اصطلاح ہے اسلامی حکومت کے لئے۔ یعنی اسلامی حکومت کے تحت زندگی گذارنا ہوگی۔ اس کے لئے پہلے تو ہمیں اسلامی حکومت قائم کرنا ہوگی جس کی آواز پر لبیک کہہ سکیں۔ فرمایا۔ لِمَا یُحْیِیْكُمْ کہ اسلامی حکومت تمہیں زندگی عطا کرنے کے لئے ہے یعنی تمہاری بقا مرکزِ امت کے قیام سے وابستہ ہے۔

محض ہمیں ہی نہیں، پوری انسانیت کو آخر الامر قرآن کی طرف آنا ہے، وہی انسانیت کی منزل ہے جو ہمارے سامنے موجود ہے مگر ہم پھر بھی بھٹک رہے ہیں۔

اس سے بھی بڑھ کے اور کیا ہو گی بے بسی
منزل تو سامنے ہے مگر راستہ نہیں

کہنے کو تو بہت کچھ ہو رہا ہے۔ بڑے بڑے مدرسے، دار العلوم، تحریکیں، انجمنیں دن رات امت کے عروج کے لئے کام کر رہی ہیں۔ بڑی بڑی مساجد ضرار کثیر تعداد میں بن رہی ہیں۔

یہ اہتمامِ چراغاں بجا سہی لیکن
سحر تو نہ ہو سکے گی دیئے جلانے سے

یہاں تو آفتاب کی ضرورت ہے، دیوں سے کام نہ چلے گا۔

ویسے بھی یہ سب کچھ، دین کے نام پر مذہب کو پروان چڑھانے کے لئے کام میں لایا جا رہا ہے جیسے کسی درخت پر امربیل چڑھا دی جائے تو بظاہر تو پانی اور خوراک درخت کو ملتی ہے مگر درحقیقت خوراک امربیل لے جاتی ہے۔ خوب پھلتی پھولتی ہے مگر درخت بے چارہ سوکھتا جاتا ہے۔ یہی حال ان دنوں شجرِ اسلام کا ہے کہ دینِ اسلام کے نام پر ملّا کے مذہب کی امربیل چڑھی ہوئی ہے، مذہب پھل پھول رہا ہے، اسلام کا درخت سوکھ رہا ہے۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ کوئی اٹھے اور مذہب کی اس امربیل کو اتار پھینکے۔ مگر کسے خبر کہ کیا ہو رہا ہے اور اگر کبھی کسی کو ہوش آیا بھی تو اس نے جان لیا کہ القرآن نے ہماری منزل غلبۂ اسلام متعین کی ہے تو اس آواز یہ کہہ کر بے اثر کر دی گئی کہ ہاں یہ ہو گا مگر یہ کام تو امام مہدی کا ہے ہمارا

تمھارا نہیں۔ اس طرح نہ جانے اس بے عملی و بدعملی نے کتنے عظیم ذہن ضائع کر دیئے۔ کتنے مہدی کھو دیئے۔
نہ جانے کتنے عظیم لوگ تھے جو اس امت کے قائد بن سکتے تھے اور امتِ مرحوم کو بامِ عروج پر پہنچا سکتے تھے مگر ان سے نفرت دلائی گئی کہ مذہبی پیشوائیت قائم رہے اور وہ اپنے جوہر اپنی صلاحیتیں لئے لئے ہی دنیا سے چل بسے۔
افغانیؒ، اقبالؒ، مشرقیؒ، پرویزؒ کتنے غنچے تھے کہ بن کھلے مرجھا گئے اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھایا گیا۔
مگر اے مسلم! کچھ کرنا چاہتا ہے تو
مینارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
اور انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے

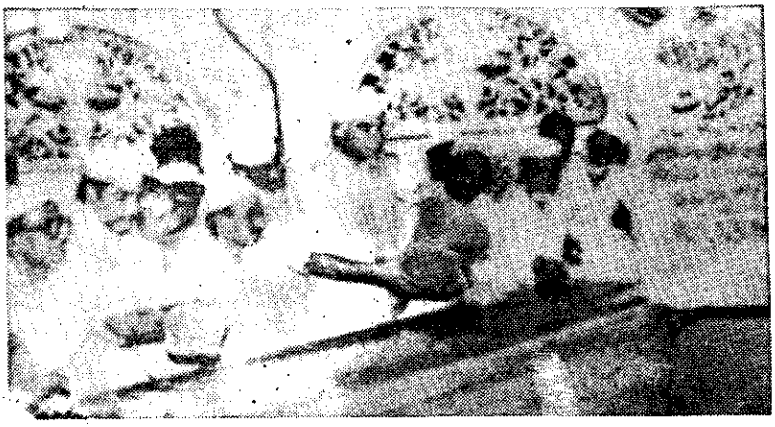

قارئین کرام! اس سال بھی داتا گنج بخشؒ کے مزار کو ستر من عرقِ گلاب سے غسل دیا گیا۔

حسین امیر فرہاد

پاکستان میں غلامی کا شجرۂ الزقوم

غلامی شرفِ انسانیت کے ماتھے پر ایک بدنما داغ ہے۔ قرآن انہی اغلال و سلاسل کو توڑنے کے لئے آیا تھا جن میں نوعِ انسان جکڑے چلی آرہی تھی۔ قرآن نے شرفِ انسانیت کا پیغام دیا۔ کہا وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ یعنی انسان بہ حیثیت انسان واجب التکریم ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت جو غلام اور لونڈیاں عربوں اور دیگر ممالک کی معاشرتی و معاشی زندگی کا جزو بن چکے تھے ان کو آہستہ آہستہ آزاد کرا کر معاشرے میں مدغم کیا۔ انہیں مراعات دیں۔ ان کے ساتھ حسنِ سلوک روا رکھا گیا۔ آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔

مگر دین جب اصلی شکل میں باقی نہ رہا۔ مذہب بن گیا، تو چور دروازے کھل گئے۔ یورپ میں تو غلامی کا رواج ختم ہو گیا۔ انسانی جانوں کی تجارت کرنے والوں کو سخت سے سخت سزائیں دی گئیں۔ جہاز ضبط کر لئے گئے۔ جلائے گئے۔ غلامی کے خلاف یو این او میں قرارداد پاس ہوئی۔ سعودی عربیہ نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کیا۔ کئی سال بعد دستخط کئے۔ مگر غلامی کا رواج اب بھی وہاں ہے۔ خیر شاعر نے کہا ہے کہ

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اپنے وطن یعنی اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اب تک غلامی پھل پھول رہی ہے۔ یہاں سندھ اور بلوچستان میں شیدی خاندان اب تک اپنے آقاؤں کی گرفت میں ہیں۔ اسی انداز سے خدمات انجام دے رہے ہیں جس طرح ان کے آباؤ اجداد کرتے تھے۔

کھیتوں میں بھی کام کرتے ہیں اور گھروں میں بھی کھانا پکاتے ہیں۔ کپڑے دھوتے ہیں۔ ان کی عورتیں، بچے، مرد، بوڑھے سب ہی آقاؤں کی خدمت میں رہتے ہیں۔ بدلے میں کوئی اجرت نہیں ملتی۔ صرف کھانا اور رہنے کے لئے جگہ۔ آقاؤں کو ان کی زندگی اور موت پر اختیار ہوتا ہے۔ پاکستان میں ان سیاہ فام غلاموں کی تعداد تقریباً پندرہ لاکھ ہے۔ غلام لڑکے اور لڑکیاں جہیز میں دی جاتی ہیں۔ اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھا سکتا۔ ایسے بھی سیاہ فام ہیں جو غلام نہیں۔ ان کی بھی سماجی حیثیت نہایت پست ہے۔ وہ بھی شیدی کہلاتے ہیں۔ یہ

لوگ مکران کے سواحلی علاقوں میں اکثر پائے جاتے ہیں۔ جو غلام لسبیلہ میں سکونت پذیر ہیں انہیں لاسی کہتے ہیں۔ سندھ میں غلاموں کی دو اقسام پائی جاتی ہیں۔

۱۔ گاراجو ــ وہ غلام جو سندھی وڈیروں کے گھر میں پیدا ہوتے ہیں۔

۲۔ مسقطی ــ انہیں مسقط سے خرید کر لایا جاتا تھا۔ ان کی قیمت چالیس سے ایک سو پچاس روپیہ تک تھی۔ لڑکیوں کی قیمت لڑکوں سے زیادہ تھی۔ ان کے خریدار بھی زیادہ ہوتے تھے۔ سندھ میں سب سے پہلے تالپور خاندان نے غلاموں کو رکھا۔ جو افریقہ سے لائے گئے تھے۔ ایران، افریقہ، زنجبار میں غلاموں کی بڑی منڈیاں لگتی تھیں جو جانوروں کی طرح زنجیروں میں جکڑے ہوتے تھے۔ انہیں جانوروں کی طرح بیچا اور خریدا جاتا تھا۔

افسوس کہ ہمارے ہاں غلامی کا شجرۃ الزقوم اب تک پھل پھول رہا ہے۔ امریکہ انسانیت کا واحد علمبردار، حقوقِ انسانیت کا ڈھنڈورا تو پیٹتا ہے ــ مگر

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

التماس

قارئینِ طلوعِ اسلام سے التماس ہے کہ جو حضرات بزموں کے باقاعدہ رکن ہیں وہ اپنے خریداری نمبر سے مطلع فرمائیں تاکہ انہیں ان کی متعلقہ بزم کے حوالہ سے نیا خریدی نمبر جاری کر دیا جائے۔

ناظمِ ادارہ

حقائق و عبر

جہاد کا مادہ ہے (ج۔ہ۔د) جس کے معنی ہیں محنت اور مشقت، وسعت اور طاقت۔ یعنی کسی مقصد کے حصول کے لئے اپنی طاقت اور وسعت کو پورا پورا صرف کر دینا اور اسے انتہا تک پہنچا دینا۔ جو اس سعی پیہم میں لگا ہو اسے مجاہد کہتے ہیں۔

اسلامی نظام کے استحکام کے لئے جو کوشش کی جائے اسے جہاد فی سبیل اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس کا آخری مقام وہ ہوتا ہے جہاں مردِ مومن میدانِ جنگ میں سر بکف اور شمشیر بدست کفار کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے تاکہ وہ جان دے کر دین کے راستے میں مزاحم ہونے قوتوں کو راستے سے ہٹا سکے۔

مگر اب انکشاف ہوا ہے کہ مجاہد ٹی وی کو سنگسار کرنے اور رسی سے باندھ کر سڑک پر گھسیٹنے اور پھر تیسری منزل سے پھینک کر آگ لگانے والے کو کہتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو ذیل کی تحریر پڑھئے جو مجلہ "الدعوہ" لاہور کے جون کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

> "باغبان پورہ لاہور کے مجاہد ساتھی محمد اجمل نے اپنے گھر سے ٹی وی بدمعاش کو نکال کر اس کی مرمت کے لئے دفتر مرکز الدعوہ والارشاد لاہور پہنچا دیا۔"
>
> "دفتر "الدعوہ" لاہور نے مجاہد ساتھی عبدالرشید سلفی اور حافظ مبشر ٹی وی شیطان کو مرکز کی تیسری منزل پر لے گئے، وہاں اسے پتھروں سے سنگسار کیا اور بعد ازاں پٹرول ڈال کر آگ لگا دی گئی۔ سنگسار کرنے سے پہلے اس کے سپیکر نکال لئے گئے جس کے ذریعے آجکل مرکز "الدعوہ" کے مطبخ (باورچی خانہ) میں تلاوت اور جہادی نظمیں سنی جا رہی ہیں۔!!"

طلوعِ اسلام

مجلہ الدعوہ کا دعوٰے ہے کہ اب تک وہ ایک صد سے زیادہ ٹی وی سیٹوں کو چکنا چور کر چکے ہیں کیونکہ

ٹی وی بدمعاش ہے۔ فحاشی، عریانی و بدعات و خرافات کے پھیلانے میں اس کا ہاتھ ہے۔
ٹی وی کو بدمعاش کہنا، سنگسار کرنا، سڑکوں پر گھسیٹنا، تیسری منزل سے پھینکنا، پٹرول ڈال کر جلانا، اس عمل کو جہاد کہنا اور ایسا کرنے والے کو مجاہد کہنا۔ چہ خوب!
مُنہ بھی کالا کر دیتے تو بہتر ہوتا۔ ان کے ہاں تو ایک خاص گناہ کے مرتکب کو سنگسار کیا جاتا ہے۔ ٹی وی نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا کہ اسے بھی سنگسار کرنا پڑا!
جہاں تک فحاشی کا الزام ہے، تو اس کا ذمہ دار تو پاکستان ٹی وی سنٹر کو ہونا چاہیے جو پروگرام نشر کرتے ہیں۔ بہتر تو یہ تھا کہ وفد کی صورت میں جاتے اور ٹی وی کے اربابِ بست وکشاد کی خدمت میں اپنی عرضداشت پیش کرتے کہ وہ اپنے پروگراموں کی تطہیر کرے۔ ان کی سزا ٹی وی کو دینا ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی نل کو جوتیاں مارے کہ اس میں گرم پانی کیوں آرہا ہے! یا بجلی کے تار کو مارنا شروع کر دے کہ اس نے مجھے شاٹ مارا ہے! اور سپیکر مرکز کے مطبخ میں لگا دئے تلاوت اور نظمیں سننے کے لئے۔ یہ بھی خوب رہی۔
کچھ لوگ کہتے ہیں اللہ نے سور کا فقط گوشت حرام کیا ہے، کھال بال اور چربی استعمال میں لائی جا سکتی ہے اسی کلئے کے تحت غالباً ٹی وی حرام اور سپیکر حلال!!

يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝ (۷۸/۴۰)

سیرت، شلوار اور اسلام

ماہنامہ 'الدعوہ' لاہور اپنے جون ۱۹۹۴ء کے شمارے میں لکھتا ہے کہ

توحید آباد گلیات میں دعوتی و جہادی کام

یہاں بھائی ابوجابر خالد ربانی نے علاقے میں فحاشی و عریانی اور بدعات و خرافات کے خلاف زبردست کامیاب مہم شروع کی ہوئی ہے۔ انہوں نے ایک ملاقات میں بتایا کہ ان کے تربیت یافتہ شاگرد علاقے کے بازار میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور فحاشی و عریانی کے مرتکب دکانداروں کو نہ صرف وعظ و نصیحت کرتے ہیں بلکہ انہیں اس فعل کے ارتکاب سے روک دیتے ہیں۔ جن کی شلواریں ٹخنوں سے نیچے ہوتی ہیں، انہیں اللہ کے رسول کی وعیدیں سناتے ہیں کہ مرد کی آزار (لنگی شلوار) ٹخنوں سے جس قدر نیچے ہوگی اس قدر وہ جہنم کی وادی میں ہوگا۔ یہ بھائی ان وعیدوں کے ڈر سے اپنی آزاریں ٹخنوں سے اوپر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

بھائی ابوجابر نے اسکول میں خصوصی درس دیا جس کی وجہ سے ۴۵ لڑکے ۱۵ دن کی تربیت کے لئے افغانستان گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو ان کی سیرت میں بڑی تبدیلی آئی۔ ان سب کی شلواریں ٹخنوں سے اوپر ہیں۔ جبکہ باقی لڑکوں کی نیچے تھیں۔ ہیڈ ماسٹر کا کہنا تھا کہ اس طرح اسکول کا نظم خراب ہو رہا ہے کہ کسی کی شلوار اوپر ہے کسی کی نیچے۔ جب بھائی ابوجابر نے قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلے کی اہمیت پر روشنی ڈالی تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے سب کو شلواریں ٹخنوں سے اوپر رکھنے کو کہہ دیا۔

بھائی ابوجابر نے بتایا کہ اب اسکول کے لڑکوں نے اسکول کی گھنٹی بجانا بھی بند کر دی ہے کیونکہ ان کے نزدیک اس سے عیسائیوں کی اذان مماثلت ہوتی تھی۔ اللہ سب بھائیوں کو استقامت عطا کرے۔ آمین۔

مستوجب الاحترام کون ہے؟

مانکی کے گردونواح میں ایک مولانا کی ملاقات ایک چرواہے سے ہوئی۔ مولانا نے پوچھا یہاں کیا کرتے ہو۔ چرواہے نے کہا، پیر صاحب مانکی شریف کے مویشی شریف چراتا ہوں۔ مولانا نے کہا، یہ بغل میں کیا ہے؟ کہا، قرآن۔ مولانا نے کہا، بدبخت، پیر کے تو مویشی بھی شریف ہیں اور قرآن شریف جس کے ساتھ شریف کہنا لازمی تھا، اسے صرف قرآن کہہ رہے ہو۔

اس سے ملتا جلتا واقع ملاحظہ ہو۔

صاحب القرآن کون ہیں؟ اللہ

اور قرآن کے مفسر کا نام کیا ہے؟ ذرا جگر تھام لیجئے۔

تفسیر بیان القرآن ——— مصنف:۔ سلطان المفسرین، مقدام الراسخین، جامع کمالات، منبع الحسنات، ماہر علوم قرآنیہ، صاحب الشریعہ والطریقہ البحر المعرفہ والحقیقت، کاشف اسرار خفی وجلی مولانا محمد اشرف علی تھانوی دامت برکاتہم وفیوضاتہم خلیفہ حضرت مولانا حاجی شاہ امداد اللہ صاحب تھانوی، مہاجر مکی رحمتہ اللہ علیہ۔

طلوعِ اسلام

۱۔ یہ کتاب اسی عبارت کے ساتھ بازار میں موجود ہے جس کا جی چاہے دیکھ لے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضرت موسیٰؑ کی دُعا

یہ خوبصورت دُعا حضرت موسیٰؑ کی زبانِ مُبارک پر اس وقت اُبھری تھی جب ربّ العزّت نے انہیں حکم دیا " اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۰/۲۴) " تم فرعون کی طرف جاؤ اس کی سرکشی حد سے گزر گئی ہے۔" اس وقت حضرت موسیٰؑ کو احساس ہوا کہ انہیں ایک بڑی ہی سخت مہم کے لئے منتخب کیا گیا ہے جس کا ہر مرحلہ ایک کڑی آزمائش ہوگا۔ قانونِ خداوندی کے مطابق انسانی زندگی جہدِ مسلسل کا نام ہے (۵۳/۳۹) جس میں ہر دو چار قدم کے بعد امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان گھڑیوں میں یہ دعا آپ کے لئے بھی اسی طرح تقویت کا باعث بن سکتی ہے جس طرح یہ حضرت موسیٰؑ کے لئے بنی تھی۔ بشرطیکہ آپ بھی اللہ تعالیٰ کے قانون کی صداقت پر یقینِ محکم رکھتے ہوئے زندگی کے صحیح راستے پر پختگی سے گامزن ہوں گے۔ یہ سب کچھ آپ کے اپنے اعمال سے ہوگا (۲/۱۸۶)

دُعا:-

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ۝

"اے میرے ربّ! میرے سینے میں وسعت اور کشادگی عطا کر دے (کہ بڑی سے بڑی مشکل بھی مجھے پریشان نہ کر سکے۔")

وَ یَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ ۝

"اور جو دشواریاں میری راہ میں آئیں، انہیں مجھ پر آسان کر دے۔"

وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ۝

"اور میری زبان میں ایسی طاقت اور روانی پیدا کر دے۔"

یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ۝ (۲۰/۲۵ — ۲۸)

"کہ میری بات لوگوں کی سمجھ میں آجائے (اور سیدھی ان کے دل میں اُتر جائے)۔"

بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اعزاز الدین احمد خان

کرنل غلام سرور

بھارت کے جارحانہ عزائم اور
اُمتِ مسلمہ کی ذمہ داریاں

بھارت ایک عرصہ سے علاقائی طاقت بننے کے خواب دیکھ رہا ہے اور اس ضمن میں اس نے پہلے سوویٹ یونین سے اپنے روابط استوار کیے اور اس کے زمین بوس ہو جانے کے بعد اب اس نے امریکہ کو اپنے شیشے میں اتار لیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ علاقہ میں ایک منی پاور کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آسکے۔ حال ہی میں پرتھوی میزائل کا کامیاب تجربہ اور اسے پاکستانی سرحدوں پر نصب کرنے کا منصوبہ اس کے جارحانہ عزائم کی نشاندہی کرتا ہے۔ امریکہ بھارت کے میزائلی تجربات پر بظاہر مضطرب دکھائی دیتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا یہ ظاہری اضطراب محض دکھاوے کا ہے۔ جہاں تک مسلم دشمنی کا سوال ہے ...... "اصل میں دونوں ایک ہیں"..... بھارت امریکہ کے کھوکھلے احتجاج کی چنداں پروا نہیں کرتا اور وہ پوری تندہی کے ساتھ اپنے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل میں سرگرداں ہے۔ اس کی کارروائیوں کا اصل ہدف پاکستان ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بھارت نے آج تک پاکستان کے وجود کو صدق دل سے قبول نہیں کیا۔ اکھنڈ بھارت بنانے کا خواب ہنوز اس کے سر پر سوار ہے اور اس کی روزِ اول سے ہی یہ خواہش رہی ہے کہ پاکستان کے وجود کو ختم کر کے اسے دوبارہ بھارت میں شامل کر لیا جائے۔

اپنے بھوکے ننگے عوام کی اسے چنداں پروا نہیں۔ اس کی منشا یہی ہے کہ وہ اسلحہ سازی میں اتنی دسترس حاصل کرے کہ پاکستان تو کیا، علاقے کے دوسرے ممالک بھی اس سے خوفزدہ ہو کر اس کی بالادستی کو قبول کر لیں۔ بھارت نے اپنے ہاں جدید اسلحہ کے جو انبار لگا رکھے ہیں ان کا تو ذکر ہی چھوڑیئے۔ صرف میزائلوں کے حوالے سے آپ دیکھیں تو اس کے اصل ارادوں کا آپ کو علم ہو جائے گا۔ پرتھوی، اگنی، تری شول، آکاش پر ہی بھارت اکتفا ہی نہیں کر رہا۔ اب "سوریا" نام کے بین البراعظمی میزائل بنانے کے منصوبے پر عمل پیرا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس میزائل کی مار اٹھائیس سو میل تک ہو گی۔ ظاہر ہے یہ میزائل صرف پاکستان کے لئے خطرے کا موجب نہ بنے گا، بلکہ خلیج کے تمام ممالک بھی اس کی زد میں آجائیں گے۔ بھارت کی سرتوڑ کوشش یہی ہے کہ علاقہ میں اسے ایک منی سپر پاور کے طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ امریکہ کے "نیو ورلڈ آرڈر" میں بھی اس بات کا بطورِ خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ جنوبی ایشیا اور اس کے قرب و جوار کی

ریاستوں پر بھارت کی بالادستی کو تسلیم کرلیا جائے۔ ادھر مشرقِ وسطیٰ کے مسلم ممالک کو مجبور کردیا جائے کہ وہ اسرائیل کے دست نگر بن کر رہیں۔ امریکہ کی یہ بھی دلی تمنا ہے کہ بھارت اور اسرائیل جیسے اسلام دشمن ممالک زیادہ طاقت ور بن کر ابھریں تاکہ وہ اسلامی تحریکوں کے ابھرنے کے تمام امکانات کو ختم کرسکیں۔ تسلیم امریکہ میں کچھ ایسے راست فکر عناصر بھی ضرور موجود ہیں جنہیں اپنے حکمرانوں کی سوچ سے اختلاف ہے۔ مگر ایسے عناصر کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ امریکہ میں یہودی لابی بہت مضبوط ہے اور ذرائع ابلاغ پر اس کا مکمل قبضہ ہے۔ یہ لابی بھارت کے حق میں ہے اور چاہتی ہے کہ بھارت کے ہمسایہ ممالک اس کے تابع مہمل بن کر رہیں۔ اس تناظر میں ہم پر لازم ہے کہ ہم سستی جذباتیت سے قطع نظر، حالات کا معروضی جائزہ لیں اور زمینی حقائق کی روشنی میں اپنی حکمتِ عملی وضع کریں۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایک ایسا طبقہ موجود ہے، جو ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ بھارت کی بالادستی قبول کرنے میں ہی ہماری عافیت ہے۔ اس طبقے کا خیال ہے کہ بھارت کی ہمسری کا خیال ہمیں دل سے نکال دینا چاہیئے۔ یہ طبقہ نہیں چاہتا کہ پاکستان اپنے ایٹمی پروگرام کو جاری رکھے یا اپنے دفاع کو مضبوط بنائے۔ یہ عناصر کھل کر تو اپنے ملک دشمن عزائم کا اظہار نہیں کرتے۔ مگر ان کے ہندو نواز رویئے سے کم و بیش سبھی واقف ہیں۔ یہ لوگ منافقت کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور ان کی ہمدردیاں پاکستان سے کم اور بھارت سے زیادہ ہیں۔ یہ لوگ پرلے درجے کے خودغرض اور احسان فراموش واقع ہوئے ہیں۔ جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید بھی کرتے ہیں۔ وہ پاکستان کی دی ہوئی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ مگر وکالت دشمن ممالک کی کرتے ہیں۔ سکوں کی جھنکار پر رقص کرنے والے یہ عناصر پاکستان کو کمزور کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

آجکل یہ ہندو نواز ٹولہ نجی محفلوں میں، مولانا ابوالکلام آزاد کی تعریف میں رطب اللسان دکھائی دیتا ہے۔ حوالہ یہ ہے کہ موصوف (مولانا آزاد) نے پاکستان کے تصور کی نفی کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان اگر بن گیا تو مسلمانوں کی اجتماعی قوت تین حصوں یعنی مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) بھارت اور پاکستان میں بٹ جائے گی۔ اسی تاثر کی آڑ میں ہمارے دانشور پاکستان کے وجود کو ایک اجتہادی غلطی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہم نے پاکستان بنا کر سنگین غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔

اس کے برعکس، ہمارے ہاں ایک دوسرا طبقہ ایسے افراد پر مشتمل ہے جنہیں اس بات کا احساس ہوگیا ہے کہ بھارت کے خلاف دھواں دار تقریریں کرنے سے اس کی سیاسی دکان خوب چمک سکتی ہے۔ یہ حضرات، سادہ لوح عوام کے جذبات سے آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ کبھی وہ معاہدہ تاشقند کی آڑ میں عوام کے جذبات کو بھڑکاتے ہیں اور کبھی وہ "کرشن انڈیا" کے نعرے بلند کرکے ملک بھر میں ایک ہیجانی فضا کردیتے ہیں۔ کبھی ہزار سال تک بھارت کے خلاف جنگ لڑنے

اور گھاس کھا کر ایٹم بم بنانے کا دعوے کرتے ہیں مگر افسوس ان کی اس روش نے ملک کو فائدہ پہنچانے کی بجائے ہمیشہ اسے مشکلات ہی سے دوچار کیا ہے۔ ماضی میں ہم صرف جذباتی نعرے ہی فضا میں بلند کرتے رہے۔ ادھر دشمن اپنی صفوں کو ترتیب دیتا رہا اور پھر ۱۹۷۱ء میں اس نے وہ کارنامہ کر دکھایا کہ ہمارا سر شرم کے مارے زمین میں گڑ گیا ہمارے ان کوتاہ بیں حکمرانوں نے ملکی سلامتی کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ اور آج نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ امریکہ کا دخل عمل ہماری قومی سیاست میں بہت بڑھ گیا ہے اور اب یہ تاثر عام ہوتا جا رہا ہے کہ ہماری قسمت کے فیصلے امریکہ میں طے پاتے ہیں اور اب ہمارے نان و نفقہ کی ذمہ داری بھی آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک نے سنبھال لی ہے۔ افسوس ہمارے حکمران طبقے یا حزبِ اختلاف میں سے کسی کو احساسِ زیاں تو نہیں۔ قومی معاملات میں اتنی بے حسی!!.... الامان الحفیظ!!

ہماری کسمپرسی کا عالم یہ ہے کہ آج ہم ایٹمی توانائی کی صلاحیت سے بھی دست بردار ہونے پر آمادہ ہیں۔ اب ہم خاموش ڈپلومیسی کے ذریعے اپنے معاملات طے کرنا چاہتے ہیں۔

ہماری اس کمزوری کے مضر اثرات اب دھیرے دھیرے ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے آج ہم عالمی سطح پر تنہا کھڑے ہیں۔ ادھر داخلی محاذ پر سیاسی جماعتوں کے مابین جوتم پیزار کا عمل جاری ہے اور اس میں آئے دن شدت آتی جا رہی ہے۔ سیاسی اداروں کو ایک بازیچۂ اطفال بنا کر رکھ دیا ہے۔ امریکہ کا دخل عمل آئے دن بڑھتا جا رہا ہے امریکہ ہمیں اتنی رعایت تو دینے کو تیار ہے کہ ہمارا تن و جان کا رشتہ برقرار رہے مگر وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ ہم اپنے ذہن سے بھارت کی ہمسری کا خیال نکال دیں۔ وہ بھارت کو علاقہ بھر کا چوہدری بنانا چاہتا ہے۔ پاکستان کی آزادانہ روش، اسے چنداں گوارا نہیں۔ پاکستان کو مزید کمزور کرنے کی غرض سے اب امریکہ نے "خود مختار کشمیر" کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے اور وادی میں امریکی فوجی اڈے قائم کر دیئے جائیں تاکہ چین کے اردگرد گھیرا تنگ کیا جا سکے۔ مقصد یہ ہے کہ چین کمزور ہو گا تو بھارت اپنی بالادستی منوا سکے گا۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ بھارت صرف پاکستان کے معاملے میں ہی نہیں بلکہ پورے برِ اعظم ایشیا میں ایسی بڑی طاقت کے طور پر ابھرنے کا خواہش مند ہے، جو برطانوی سامراج کی جانشین ہو اور جو اس پورے ریجن میں اپنا راج قائم کر سکے۔

ہمارے ہاں ایک تیسرا نقطہ نظر بھی محض جذبات اور منفی خوش فہمیوں پر مبنی ہے۔ اس نقطۂ نظر کی رو سے ہمیں بھارت کی جنگی تیاریوں کے جواب میں بھارت کے درجے کی جنگی صلاحیت پیدا کر لینی چاہیئے۔ ہمارے نزدیک یہ تجویز مقابلے کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت کے پاس وافر وسائل موجود ہیں۔ اگر ہمیں ایف۔ ۱۶ طیارے مل بھی جائیں تو بھی توازن میں کوئی نمایاں فرق رونما نہیں ہو سکتا۔ ایٹمی اسلحہ اور روایتی ہتھیاروں ہر دو کے بارے میں بھارت ہم سے بہت آگے ہے۔ اس تناظر میں لازم ہے کہ ہم ایسی حکمتِ عملی تیار کریں جس سے ہم اپنے دفاع کا اہتمام کر سکیں۔

قوموں کے عروج زوال کے اسباب پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کسی جمہوری نظام میں فیصلہ کن کردار اس ملک کے سیاسی اور جمہوری ادارے ہی بجا لاتے ہیں۔ سیاسی ادارے اگر مضبوط ہوں تو پھر نوکر شاہی کے بے لگام گھوڑے کو تھاما جا سکتا ہے۔ عام مشاہدے کی بات ہے کہ اگر سیاسی ادارے مضبوط ہوں تو بیرونی خطرات کا بھی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جو قوم داخلی طور پر بکھر جائے، وہ دیر تک آزاد قوموں کی صف میں کھڑا نہیں رہ سکتی۔ ہر دور میں اصل طاقت سیاسی قیادت کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ جو قوم سیاسی قیادت سے محروم ہو، وہ بہت جلد افراتفری کا شکار ہو جاتی ہے اور اس کی انتظامیہ من مانی کرنے پر اُتر آتی ہے۔ حال ہی میں یہ تکلیف دہ خبر اخباروں میں چھپی کہ روس کے فوجیوں کے ایک دستے نے منہ پر نقاب ڈال کر ایک بازار کو لوٹ لیا اور اس طرح اپنی محرومیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ سب سیاسی قیادت کے عدم وجود کی دلیل ہے۔ سیاسی قوتیں مفلوج ہوں تو ہم محض اسلحہ کے بل بوتے پر ملک کا دفاع نہیں کر سکتے۔ فوجی طاقت بجائے خود کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ تجارتی طاقت، پیداواری طاقت، عام انسانوں کی خوشحالی اور بیرونی ممالک میں ملکی وقار اور سالمیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ان چیزوں کی عدم موجودگی میں محض تیغ و تفنگ کے بل بوتے پر کوئی جنگ جیتی نہیں جا سکتی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمیں محض ایٹم بم بنانے پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں سیاسی اداروں کے استحکام کا بھی اہتمام کرنا چاہیئے۔ تاکہ وہ ہمارے داخلی استحکام کی ضمانت دے سکیں۔

اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ قیادت کے فقدان کا ہے۔ افسوس ہنوز ہمیں ایسی قیادت میسر نہیں آسکی جو ہمیں گردابِ بلا سے نجات دلا سکے اور داخلی اور خارجی سطح پر ہمارے قومی وقار کو بلند کر سکے۔ بھارت اس وقت افرادی قوت اور وسائل دونوں اعتبار سے ہم سے آگے ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اصل میں پاکستان کی طاقت اس سے کہیں زیادہ ہے یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ بھارت کا دائرۂ اثر اپنی جغرافیائی سرحدوں تک ہی محدود ہے جبکہ پاکستان ایک وسیع و عریض عالمِ اسلام کا ایک جزو لاینفک ہے۔ بحیثیت مسلمان، ہم اپنے آپ کو جغرافیائی سرحدوں میں مقید نہیں کر سکتے۔ ہم مسلمان حقیقت میں نہ شرقی ہیں، نہ غربی۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست! آج اگر عالمِ اسلام اپنے اختلافات کو مٹا کر ایک ہو جائے تو بھارت کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ عالمِ اسلام کو بھارت کی ایٹمی میزائلی طاقت سے جو خطرات لاحق ہو گئے ہیں اس کا بھی مقابلہ ہو سکتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ عالمِ اسلام کو آنیوالے خطرات سے آگاہ کریں اور ان کی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اسلامی میں اگر اتحاد کا مظاہرہ کریں، تو تب ہی بھارت کے جارحانہ عزائم کی روک تھام کی جا سکتی ہے۔ بصورتِ دیگر، اگر ہم یونہی خوابِ غفلت میں پڑے رہے تو "ہماری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"۔

(بشکریہ جمعہ میگزین (نوائے وقت) یکم جولائی ۱۹۹۴ء)

نوٹ: بہت کم پاکستانیوں کو معلوم ہے کہ پرتھوی، اگنی، آکاش اور سوریا میزائلوں کا خالق ایک بھارتی مسلمان ڈاکٹر

زاویۂ کتب

کتاب کا نام ــــ قادیانیت ہماری نظر میں۔
مصنّف، مرتّب، مولّف و محقق ــــ محمد متین خالد صاحب۔
صفحات ــــ 746، قیمت ــــ 200/- روپیہ، ناشر ــــ عالمی مجلس تحفظِ ختم نبوت حضوری باغ روڈ، ملتان۔ کاغذ عمدہ، ٹائیٹل جاذبِ نظر۔

●

لاریب کہ قادیانیت اور رئیس الکذابین مدعیٔ نبوت غلام احمد قادیانی کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جائے گا مگر قادیانیت ہماری نظر میں، اس لئے ایک منفرد کتاب ہے کہ اس میں وہ تمام مواد یکجا کر دیا گیا ہے جو کسی نے بھی آج تک اس جھوٹے مدعیٔ نبوت کے متعلق کہا یا لکھا ہے۔

اگر کوئی قاری، قادیانیت کے متعلق کوئی تحریر پڑھنا چاہے تو اسے مختلف لائبریریوں کی خاک نہیں چھاننی پڑے گی، یہ ایک کتاب اس کے لئے کافی ہے۔ اس میں آیاتِ قرآنی بھی ہیں اور اقوالِ رسولؐ بھی، خلفاء راشدینؓ نے جھوٹے مدعی نبوت کے متعلق جو کچھ فرمایا وہ بھی اور علماء کرام و دانشوران و زعمائے قوم نے جو کچھ کہا وہ بھی۔ حتیٰ کہ ان حضرات کے خیالات و آراء کو بھی پیش کیا گیا ہے جو پہلے قادیانی تھے، اب مسلمان ہیں۔

ایسی کتاب لکھنا وقت کا تقاضا بھی تھا۔ کیونکہ آجکل قادیانی اپنا شبکۃ العنکبوت ڈش انٹینا کے ذریعے پھیلا رہے ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں راقم نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر کی تقریر سنی تھی، یہ نومسلم تھے، ہندو پاک میں کافی عرصہ رہے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ آپ ہندو پاک میں کافی عرصہ رہے ہیں، قادیانیت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ انہوں نے جو جواب دیا وہ سننے کے قابل ہے۔ کہا۔ یہ مذہب ہمارا (انگریز کا) بنایا ہوا تھا ایک خاص مقصد کے لئے۔ جب 1947ء میں برطانیہ نے ہند کو چھوڑا تو اس مذہب کو خود بخود ختم ہو جانا چاہیئے تھا، مجھے تعجب ہے کہ یہ آج تک کیوں موجود ہے۔ محمد متین صاحب نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اللہ انہیں اس کا اجر دے۔ دین سے رغبت رکھنے والوں کے لئے یقیناً یہ ایک گرانقدر تحفہ ہے۔

للعلم کہ علامہ پرویزؒ صاحب نے بھی اس فتنۃ الکبریٰ کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" جو تحریکِ احمدیت کے تابوت میں آخری کیل ہے۔ فدائینِ ناموس رسولؐ کے لئے یہ ایک نادر کتاب ہے۔ میری خواہش ہے کہ اسے بھی ضرور پڑھا جائے۔

(حسین امیر فرہاد)

ثناء اللہ

ناموسِ صحابہؓ یا توہینِ صحابہؓ؟

پچھلے دنوں، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب (امیر تنظیم اسلامی، پاکستان) کا ایک مضمون، ملوکیت، جاگیرداری اور اسلام، کے زیرِ عنوان، روزنامہ جنگ لاہور کی ۳۱ دسمبر ۹۳ء کی اشاعت میں نظر سے گزرا جس میں ڈاکٹر صاحب نے "بخاری شریف" سے صحابیٔ رسولؐ حضرت ابوہریرہؓ کی طرف منسوب ایک ایسی روایت درج فرمائی جو بالبداہت منافقینِ اسلام کی وضع کردہ اور صحابیٔ رسول (بلکہ خود رسول اللہ پر بھی) بہتان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پر میں نے کچھ سوالات بذریعہ (رجسٹرڈ) خط، ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ارسال کئے۔ لیکن! تاحال، ان کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے بخاری شریف (جسے ہمارے علماء کرام کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب قرار دیتے ہیں) سے حضرت ابوہریرہؓ کا یہ قول درج فرمایا ہے کہ "میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے (علم کے) دو برتن حاصل کئے۔ تو ان میں سے ایک تو میں نے تمہارے مابین خوب عام کر دیا ہے۔ لیکن اگر دوسرے کو عام کر دوں تو میری گردن کاٹ دی جائے گی۔"

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اگرچہ اس قول میں یہ صراحت نہیں ہے کہ وہ دو برتن کونسے ہیں۔ تاہم یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آسکتی ہے کہ جس علم کے عام کرنے سے کسی کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا تھا۔ لہٰذا اس کے عام کرنے والے کو بھی کوئی اندیشہ لاحق نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تھا نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ یعنی عبادات کے مسائل یا نکاح و طلاق وغیرہ کے مسائل کا علم۔ اور جس علم سے مراعات یافتہ طبقات کے مفادات پر آنچ آسکتی تھی۔ چنانچہ اس کے عام کرنے والے کی ذات کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا، وہ تھا نظامِ حکومت اور عمالِ حکومت اور زمینداری اور جاگیرداری سے متعلق اصولی اور تفصیلی ہدایات کا علم۔

معلوم نہیں اس روایت کو درج کر کے ڈاکٹر صاحب کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ لیکن کیا اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ (نعوذ باللہ) حضرت ابوہریرہؓ صحابیٔ رسولؐ میں اتنی جرأت بھی نہ تھی کہ (مراعات یافتہ طبقات کے مفادات پر آنچ آنے، فلہٰذا اپنی گردن کے کاٹ دیئے جانے کے ڈر سے) وہ حق بات کہہ بھی نہیں سکتے تھے؟

جبکہ اسی مضمون میں ڈاکٹر صاحب حضرت امیر معاویہؓ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہونے کے آثار حضرت امیر معاویہؓ کے عہدِ حکومت ہی میں ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے ..... بہرحال میری پختہ رائے یہ ہے کہ ان کی نیت پر شک کرنا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اپنے ایمان کو مشکوک بنانے کے مترادف ہے ..... بنابریں، یہ گمان کہ ان (حضرت امیر معاویہؓ) کا تزکیۂ نفس اور تصحیح نیت نہیں ہو پائی تھی، مزکّیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن کی حیثیت رکھتا ہے۔ (بالکل بجا فرمایا ڈاکٹر صاحب نے!) نیز اسی مضمون میں ڈاکٹر صاحب حضرت امام ابوحنیفہؒ کے متعلق فرماتے ہیں کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ بن انس نے مزارعت کو حرام مطلق قرار دے کر اس شجرِ خبیثہ کی جڑ پر بھرپور تیشہ چلایا اور کاری وار کیا اور اس کے نتیجے میں قید و بند اور زد و کوب کی صعوبتیں برداشت کیں ..... (اس کے بعد امام ابوحنیفہؒ کے شاگردِ رشید قاضی ابویوسفؒ نے جہاں قاضی القضاء کا وہ عہدہ بھی قبول فرمالیا جس کو قبول کرنے سے ان کے مربّی اور استاد نے سختی کے ساتھ انکار کر کے تشدد و تعذیب کو دعوت دی تھی۔ یعنی امام ابوحنیفہ (کہ جن کا تزکیۂ نفس براہِ راست آنحضورؐ کے ہاتھوں بھی نہیں ہوا تھا، وہ) تو زد و کوب اور قید و بند کی صعوبتیں سہہ کر بھی حق بات کہنے سے نہیں ڈرتے تھے۔ جبکہ (ڈاکٹر صاحب کے نزدیک) حضرت ابوہریرہؓ (جو کہ صحابیٔ رسولؐ بھی تھے اور جن کا تزکیہ خود آنحضورؐ کے ہاتھوں ہوا تھا، وہ) مراعات یافتہ طبقہ کے ڈر سے حق بات کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔ یا للعجب!!

قارئین کرام! یقیناً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ (ڈاکٹر صاحب کی درج فرمائی ہوئی) اس روایت کی رو سے کیا یہ گمان نہیں ہوتا کہ (نعوذ باللہ) آپ (حضرت ابوہریرہؓ) کی صحیح طرح سے تربیت نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے آپ حق بات کہنے سے بھی ڈرتے تھے؟

اور کیا اس روایت کی رُو سے (ڈاکٹر صاحب کے نزدیک) مزکّیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس و اعظم پر کوئی طعن نہیں پڑتا۔

اور کیا (ڈاکٹر صاحب کے نزدیک) اس روایت کو صحیح تسلیم کرنا، نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اپنے ایمان کو مشکوک بنانے کے مترادف نہیں ہے؟

حالانکہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ

"اور مخلوط مت کرو حق کو باطل کے ساتھ اور حق کو مت چھپاؤ، جس حالت میں کہ تم جانتے ہو۔" (۲/۴۲)

"اور ایسے شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو ایسی شہادت کو چھپائے جو اس کے پاس منجانب اللہ پہنچی ہو۔" (۲/۱۴۰)۔

"جو لوگ چھپاتے ہیں ہمارے حکموں کو جنہیں ہم نے نازل کیا ہے جو کہ واضح ہیں اور ہادی ہیں ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی۔" (۲/۱۵۹)

منافقین کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ

"وہ لوگوں سے ایسے ڈرتے ہیں جیسے اللہ سے ڈرا جائے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔" (۴/۷۷)۔

جبکہ مومنین کا شعارِ زندگی اللہ تعالیٰ یہ بتاتے ہیں کہ

"وہ اللہ کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتے۔" (۲/۱۵۰؛ سورۂ توبہ: ۱۸)

اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات کی روشنی میں جب ہم (ڈاکٹر صاحب کی درج فرمائی ہوئی) اس روایت کو دیکھیں تو ذہن میں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ

کیا "ڈاکٹر صاحب کے نزدیک" (نعوذ باللہ) آپ (حضرت ابوہریرہؓ) مومن نہ تھے؟

کیا آپؓ کو قرآنِ کریم کی ان آیات کا علم نہیں تھا جو آپ (صرف اللہ سے ڈرنے کے بجائے) مراعات یافتہ طبقہ اور اپنی جان چلے جانے (یعنی شہادت پا جانے ...... ؟) کے ڈر سے حق بات چھپاتے تھے؟

جبکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مبارک کے مطابق ظالم کے سامنے کلمۂ حق کہنا بھی جہاد ہے۔

کیا ڈاکٹر صاحب کے نزدیک حضرت ابوہریرہؓ محض زبان سے کلمۂ حق کہنے (جہاد کرنے) سے بھی ڈرتے تھے؟ کیا آپؓ کو اپنی جان جہاد سے بھی زیادہ محبوب تھی؟

قرآنِ کریم کے ان احکامات اور اس حدیث نبویؐ کے بعد بھی اگر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو اصرار ہے کہ نہیں! یہ روایت بالکل درست اور حضرت ابوہریرہؓ کی ہی بیان کردہ ہے تو یہ جرأت انہی کو مبارک۔ ہم تو اس کے تصور سے بھی کانپتے ہیں کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابیؓ کے متعلق دل میں بھی یہ خیال کریں کہ وہ حق بات کو چھپاتے تھے!!

معلوم نہیں یہ روایت "سپاہِ صحابہؓ" والوں کی نظر سے نہیں گزری (حالانکہ ان کے دار العلوموں میں ہر سال "بخاری شریف" کا ختم شریف ہوتا رہتا ہے)۔ یا وہ جان بوجھ کر اس سے صرفِ نظر کر رہے ہیں؟ اگر یہی روایت کوئی غیر مسلم (راجپال وغیرہ) یا مسلمانوں ہی کا کوئی دوسرا فرقہ اپنے ہاں درج کرے، تو فوراً ان "علمائے کرام" کی طرف سے اس کے خلاف توہینِ رسالتؐ و توہینِ صحابہؓ کا فتوے جاری ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ (اور اس جیسی بہت سی دوسری "خلافِ قرآن"[1] روایات) ان کی اپنی کتابوں میں درج ہیں، اس لئے ان کے نزدیک

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث"۔

سے ناموسِ رسالتؐ اور ناموسِ صحابہؓ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یا للعجب!

جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے!

آخر ہمارے علمائے کرام، قرآنِ کریم کی روشنی میں کام لینے کو اپنے لئے وجہِ ہتک کیوں سمجھتے ہیں؟

اطلاع برائے پیشگی کھاتہ داراں

اطلاعاً عرض ہے کہ پیشگی کھاتوں میں سے اکثر یا تو واجب الادا ہیں یا ان میں رقم اتنی کم ہے کہ پرچہ مزید جاری رکھنے کے لئے ناکافی ہے۔ ہم نہ تو اپنے کرم فرماؤں کو یاد دہانی کے نوٹس بھجوانا مناسب سمجھتے ہیں نہ ہی ان کا پرچہ بند کرنے کے حق میں ہیں۔ پیشگی کھاتہ داراں کو ان کے کھاتوں کی تفصیل بھجوائی جا رہی ہے۔ تاہم اگر اس قسم کی کوئی اطلاع ان تک نہ بھی پہنچے تو بھی تمام کھاتہ داران سے التماس ہے کہ وہ اپنے کھاتوں میں معقول رقم جمع کرانے کا اہتمام کریں تاکہ ادارہ واجب الادا رقوم کی وجہ سے مالی پریشانیوں کا شکار نہ ہو۔

چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام

حدیث النبیؐ

بہادر وہ نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے، بہادر تو وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے اوپر قابو رکھے۔ (بخاری، مسلم، موطا)

روزمرہ کے معاملات میں قرآنی ہدایات

اسلامی معاشرت
علامہ پرویز

عام آدابِ معاشرت

۱۔ دوسروں کے ہاں جانے کے لئے اجازت طلبی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ (۲۴/۲۷)

"اے ایمان والو! اپنے گھر کے علاوہ جب کسی دوسرے کے ہاں جاؤ تو اجازت لئے بغیر ان کے مکان کے اندر مت داخل ہو اور اندر جا کر اہلِ خانہ کو سلام کرو۔"

اگر اجازت نہ ملے تو؟

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ (۲۴/۲۸)

"اور اگر اُن کے ہاں کوئی موجود نہ ہو تو اندر مت جاؤ جب تک تم اس کی اجازت نہ حاصل کرو اور اگر تم سے وہاں کہا جائے کہ اس وقت معاف رکھئے تو واپس چلے آؤ۔ یہ تمہارے لئے بڑی پاکیزہ بات ہے۔"

البتہ ایسے مکانات جن میں کوئی رہتا نہ ہو اور اس میں تمہارا مال اسباب پڑا ہو (مثلاً گودام

وغیرہ) تو ان میں جانے کے لئے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ اس کی تشریح قرآنِ کریم نے آیت (۲۹/۲۴) میں کر دی ہے۔

۳۔ آدابِ محفل | یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اِذَا قِیْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَ اِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا...○ (۵۸/۱۱)

"اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں ذرا جگہ کھول دو، تو جگہ کھول دیا کرو۔ اللہ تمہارے لئے کشادگی پیدا کر دے گا اور جب کہہ دیا جائے کہ اب مجلس برخاست ہوتی ہے تو تم اٹھ کھڑے ہوا کرو۔"

مجلس میں ناشائستہ حرکات | قرآن کریم میں قوم لوطؑ کے جن جرائم کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ

تَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ (۲۹/۲۹)

"تم لوگ اپنی مجلسوں میں ناشائستہ اور نامناسب حرکتیں کرتے ہو۔"

۴۔ جانے کی اجازت | مومنین کی ایک صفت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ جب انہیں کسی کام کے لئے اکٹھا کیا جاتا ہے تو

لَمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰی یَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ (۲۴/۶۲)

"جب تک انہیں اجازت نہ دی جائے جاتے نہیں۔"

لہذا مجلس میں اس طرح بیٹھو کہ دوسروں کو بھی بیٹھنے کے لئے جگہ مل جائے۔ کوئی نازیبا حرکت نہ کرو۔ کوئی نامناسب بات نہ کرو۔ جب مجلس برخاست ہو جائے تو اٹھ کر چلے جاؤ اور جب کسی کام کے لئے بلایا جائے تو اجازت

لئے بغیر مت جاؤ۔

۵۔ کھانے کی دعوت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ۙ وَ لٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ؕ (۳۳/۵۳)

"اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں بن بلائے نہ جایا کرو اور جب تمہیں کھانے کے لئے بلایا جائے تو اتنی جلدی نہ بیٹھا کرو کہ کھانا پکنے تک انتظار کرتے رہو۔ بلکہ جب تمہیں بلایا جائے تو جو وقت دیا جائے اس وقت آیا کرو۔ اور جب کھانے سے فارغ ہو چکو تو چلے جایا کرو۔ یونہی باتیں کرنے کے لئے نہ بیٹھے رہا کرو۔"

یہ باتیں اگرچہ چھوٹی چھوٹی ہیں لیکن باہمی تعلقات کی خوشگواری کے لئے اور معاشرہ میں نظم اور خوبصورتی پیدا کرنے کی خاطر ان پر عمل کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔

○○○

بزمہائے طلوعِ اسلام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ادارہ میں طلوعِ اسلام کے پرانے پرچے، مجلد اور غیر مجلد دستیاب ہیں۔ مجلد ۱۲ پرچوں کی قیمت مبلغ ۵۰ روپیہ، کھلے پرچے بزموں کو بلا قیمت دیئے جائیں گے۔

ادارہ طلوعِ اسلام

they would be throwing a challenge to Allah to the effect that "notwithstanding Your injunction that there could be no external change without bringing about an inner revolution, we could achieve the same object without bothering about the inner aspect" [نعوذ باللہ].

The irony of the situation is that today even the non-Muslims after experimenting with various systems based on intellect alone, are coming to the conclusion that no revolutionary changes can be brought about without ideological and psychological change, and are becoming inclined willy-nilly to accept the truth of this Quranic Principle, enunciated in the verse 13:11. However, we the Muslims of Pakistan in particular and the Muslims of the world in general have, in a manner of speaking, established a front against Allah Himself in trying to effect an external change in our condition without first effecting an internal one in our thinking. Therefore, what-ever is happening to us is the result of these defiant and misdirected efforts. Unless and until we give up the present trend and endearvour to bring about a radical transformation in our "Self" in the light of Quranic principle elucidated above, there can be no improvement in our condition.

(tobe continued

WHO DOES NOT HOPE TO WIN HAS ALREADY LOST

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ص

"If you do not accept the basic truth of the laws and injunctions revealed in the Holy Quran, and placed before the world by Allah's Messenger [P], then, you produce one such law, if you can."

Elaborating this challenge further the Quran Says:-

وَ ادْعُوْا شُهَدَاءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ.... (2:23)

"In your endeavours to match the Quranic injunction/Law, you may call, besides Allah, all the thinkers and intellectuals of the whole wide world, but you shall never succeed, do what you may". Shall we not heed this challenge?

The law given in the verse 13:11 may be just an idea, a principle or food for thought for the Non-Muslims; but for the Muslims who claim a firm belief in the authenticity of the Quran, its obedience in letter and spirit, is an absolute must. If the Muslims were to think that there could be other ways of changing condition of a people than the one given in the Quran, it would amount to infidelity [كُفر]. And if they think there could be other ways in addition to the one given by Allah, it would amount to joining partners with Allah [شرک]. And if they ignore/defy this Quranic principle and experiment with other methods they consider workable, then

وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوْءًا فَلَا مَرَدَّ لَهُ ۚ وَمَا لَهُمْ مِنْ دُوْنِهِ مِنْ وَّالٍ ۝

"It is also an unalterable law that when a people, on account of their own misdeeds, face destruction, then no power on earth can stop it nor can such a people find any helpers or sympathisers besides Him". [13:11]

We should take heed of this Divine Law for Allah may not give us such moments of respite again and again. It is this law of Allah that is the topic of my discourse, for it alone contains the panacea for the ills afflicting the Ummah in general and our sick society in particular.

Challenging Allah's Law

However strange it may look but it is true all the same that we are trying to change our Muslim Nation [ملّت] without first bringing about a radical change in our thinking, outlook and inner self [psychology] as ordained by Allah. And stranger still, we call this "Rejuvenation of Islam". Trying to change our external condition without first bringing about an internal revolutionary change in ourselves is like throwing a challenge to Allah and His unalterable laws. [God Forbid نعوذ باللہ]. We do not perhaps realise the full implications of the course we are following. Surely we do not want to join the ranks of those whom Allah has Himself challenged by saying;-

The important point to remember is that in secular system nationality by race is automatic but to form a Nation on ideological basis one has to educate the individual in that Ideology. Today we are facing the consequences of neglecting this basic aspect. As a result some have become victims of frustration, others have become in-different to the struggle of finding a purpose or goal for national life, while the young have become rowdy and rebellious, completely lacking a sense of direction.

The Quranic Remedy

For all these ills the intellectuals blame the faulty political, economic, cultural and social systems. Let us see what the Holy Quran says about emerging out of this "slough of Despond" [hopeless situation]. It says:-

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ

"Remember no nation can bring about external changes or make progress unless and until there is a psychological change or an internal revolution in its outlook and thought process. (In other words) Allah will never change the condition of a people until they change it themselves with their own souls. [13:11]

This is an unalterable law of Allah which brooks no defiance. The whole edifice of individual life and the life of nation is built upon this law. Further says Allah:-

"یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے"

"People's faith in their Ideology is the basic requirement for building a nation".

Since we did not arrange for the right education of our new generation and did not set goals before them for which this country was created, we have only ourselves to blame for the brazen-faced destruction of moral values that is damaging not only our present but is making the future look very bleak. The committees and commissions set up to investigate the causes of hell let loose in Karachi and Hyderabad - the cities of "Gate-way to Islam" - are apt to get entangled in the whirlpool of superficial causes and not go below the surface to fathom the real and basic reasons. An examination in depth would reveal:-

تماشا ایک ہی ہے تم اسے جس دور میں دیکھو
وہی بھولی ہوئی منزل، وہی بھٹکے ہوئے راہی!

"The pageant is the same whatever the age.

The same lost horizon.

the same lost wayfarers.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ALLAH'S LAW OF CHANGING CONDITION OF A PEOPLE-2

By

Izaz D.A.Khan

Note:- *(In the first instalment of this article a bird's eye view of the prevailing degeneration in the Muslim Ummah in general and in Pakistan in particular was given. It was brought out that the main reasons for deterioration in the Pakistani Muslim Society was that we had lost sight of the basic plea for the creation of Pakistan. Unfortunately we did not have a single leader, after the Quaid-e-Azam, who had a clear concept of the Ideology of Pakistan to guide the nation towards its real goal. As a result our Muslim Society fell prey to the cancer of doubt regarding the basic philosophy for the creation of Pakistan. Editor)*

Cancer of Doubt

After the creation of Pakistan, it became absolutely essential that the Ideology of Pakistan should be determined and defined positively because otherwise even the first step towards achieving the objectives of Pakistan could not be taken. But we ignored the objective; [and continue to do so] sordid gains near at hand took the better of us. As a result our destination, which was round the corner, receded father and farther. Our "camel's load" [our Ideology] got lost in the ensuing chaos and confusion. Consequently our Muslim Nation lost faith in the very basic philosophy for the creation of Pakistan. And a society that falls a prey to the cancer of doubt can never be expected to take healthy steps, because as Allama Iqbal puts it:-